قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

سلسلہ

التبلیغ

کا

اڑتیسواں وعظ مسمّٰی بہ

العبرۃ بذبح البقرۃ

منجملہ ارشادات حکیم الامۃ حضرت مرشدی ومولائی مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی دام ظلہم العالی

حسب فرمائش جناب ناظم صاحب امداد المواعظ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر

بابت ماہ ربیع الثانی سنہ ١٣٤٢ ہجری

احقر شبیر علی عفی عنہ

مالک اشرف المطابع تھانہ بھون کے اہتمام سے چھپا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الوعظ المسمّٰی بہ

العبرة بذبح البقرة

الاشتات	من المستمعون	من ضبط	من بیّن	ماذا	لم	کیف	کم	متی	این
متفرقات	سامعین کی تعداد اندازاً	کس نے لکھا	[illegible]	کیا مضمون تھا	کیوں ہوا	کس طرح ہوا	کتنا ہوا	کب ہوا	کہاں ہوا
[illegible]	تقریباً ۵۰	مولوی ظفر احمد صاحب عثمانی	[illegible]	[illegible]	[illegible]	منبر پر بیٹھ کر	[illegible]	۱۵ ذیقعدہ ۱۳۳۸ھ بعد نماز جمعہ	مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان

لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشہد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ
ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم **اما بعد**
فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ۰ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۰ واذ قال موسیٰ
لقومہ ان اللہ یامرکم ان تذبحوا بقرۃ ط قالوا اتتخذنا ھزوا ط قال اعوذ
باللہ ان اکون من الجٰھلین ۰ قالوا ادع لنا ربک یبین لنا ما ھی ط قال انہ یقول
انھا بقرۃ لا فارض ولا بکر عوان بین ذلک ط فافعلوا ما تؤمرون ۰ قالوا ادع لنا
ربک یبین لنا ما لونھا ط قال انہ یقول انھا بقرۃ صفراء فاقع لونھا تسر النٰظرین ۰
قالوا ادع لنا ربک یبین لنا ما ھی ان البقر تشٰبہ علینا وانا ان شاء اللہ لمھتدون ۰
قال انہ یقول انھا بقرۃ لا ذلول تثیر الارض ولا تسقی الحرث ج مسلمۃ لا شیۃ
فیھا ط قالوا الٰئن جئت بالحق ط فذبحوھا وما کادوا یفعلون ۰ واذ قتلتم
نفسا فادّٰرءتم فیھا ط واللہ مخرج ما کنتم تکتمون ۰ فقلنا اضربوہ ببعضھا ط
کذلک یحیی اللہ الموتیٰ ویریکم اٰیٰتہ لعلکم تعقلون ۰ ثم قست قلوبکم من بعد
ذلک فھی کالحجارۃ او اشد قسوۃ ط وان من الحجارۃ لما یتفجر منہ الانھٰر ط وان
منھا لما یشقق فیخرج منہ الماء ط وان منھا لما یھبط من خشیۃ اللہ ط وما اللہ
بغافل عما تعملون ۰

یہ چند آیات ہیں سورۂ بقرہ کی جنسے مجھے ایک ضروری مضمون بیان کرنا ہے بعض احباب نے
اس عرصہ میں درخواست کی تھی کہ کچھ بیان کردیا جائے کسی خاص مضمون کی تو فرمائش نہ تھی بلکہ
عام درخواست تھی جس کا منشا صرف یہ تھا کہ بہت دنوں سے یہاں بیان نہیں ہوا میں نے
اُسوقت پختہ وعدہ نہیں کیا بلکہ یہ کہدیا تھا کہ کوئی مضمون ذہن میں آگیا تو کچھ عرض کردونگا
کیونکہ عادت یہی ہے کہ میں تکلف کرکے بیان نہیں کرتا بلکہ خود اگر کوئی مضمون ذہن میں
آجاتا ہے بیان کردیتا ہوں اور جی بھی یہی چاہتا ہے کہ تکلف کرکے بیان نہ کیا جائے کیونکہ
اُس سے اثر بھی نہیں ہوتا اور تعب بھی بہت ہوتا ہے اسکے بعد میرا خود بھی جی چاہا کہ کوئی
مضمون آجائے تو اچھا ہے کیونکہ درخواست خلوص پر مبنی تھی اُسکے پورا ہونے کو میرا خود دل

چاہتا تھا چنانچہ ایک مضمون ذہن میں آگیا جو بہت کام کا مضمون ہے اور عام ضرورت کا ہے پھر جی چاہا کہ کوئی مضمون اسوقت کے مناسب بھی بیان ہوجائے تو اچھا ہو کیونکہ عام ضرورت سے خاص وقت موجود کی ضرورت اشد ہوتی ہے ۱۲) چنانچہ بحمد اللہ یہ خیال بھی پورا ہوگیا اور اسکے لئے مجھے دوسرے مضمون کے اختیار کرنے کی ضرورت نہ پڑی بلکہ پہلے ہی مضمون کی تقریر اس طرح ذہن میں آئی جسمیں ضرورت وقت کا بیان بھی آگیا اور وقت سے میری مراد خصوص یہ وقت حاضر نہیں بلکہ ایک وقت محدود مراد ہے جو کہ ممتد ہے جسمیں عید الاضحیٰ اور قربانی کے ایام بھی داخل ہیں اور ضرورت وقت سے مراد بھی قربانی کی ضرورت ہے جو عنقریب آنیوالی ہے تو یہ مضمون جو اسوقت بیان ہوگا اسمیں تین پہلو ہیں (۱) یہ کہ وہ مضمون ضروری ہے اور عام ضرورت کا ہے (۲) پہلو یہ ہے کہ وہ مضمون قربانی کے مناسب ہے (۳) پہلو یہ ہے کہ جو قصہ ان آیات میں مذکور ہے اُسکو مضمون عام سے تعلق ہے اور اُسکے واسطہ سے قربانی سے بھی تعلق ہے کیونکہ جس چیز سے ایک چیز کو تعلق ہوا کرتا ہے اُسکے متعلق کو بھی اُس سے تعلق ہوا کرتا ہے پس مضمون عام کو قربانی سے تعلق ہے اور قصۂ مذکورہ فی الآیات کو مضمون عام سے تعلق ہے تو قربانی کو بھی اس قصہ سے تعلق ہوگا۔ اب میں پہلے اس مضمون عام کو بتلانا چاہتا ہوں جو عام ضرورت کا ہے تاکہ تعیین مقصود کے بعد انطباق سہل ہوجائے سو وہ مضمون مقصود یہ ہے کہ نفس کشی کی ضرورت ہے یعنی مجاہدۂ نفس کی اسکی عام ضرورت ظاہر ہے کیونکہ نفس سب کے ہے ایسا کون ہے جسکے نفس نہیں اور مجاہدہ و اصلاح نفس کی بھی سبکو ضرورت ہے ایسا کون ہے جو اصلاح نفس سے مستغنی ہو۔ اور سامعین سے میں اتنی درخواست کرتا ہوں کہ وہ نفس کشی کا لفظ سُنکر اُسکی تفسیر اپنے ذہن سے کچھ نہ گھڑیں اور نہ اسکی ضرورت ہے بلکہ اسکی حقیقت وہی ہے جو شریعت نے بتلائی ہے ہمکو اپنی رائے کو اسمیں دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں اور اُسکی تحقیق عنقریب اپنے موقعہ پر اسی وقت عہ ہوجائے گی اور یہ میں نے اسلئے کہدیا کہ بعض لوگ نفس کشی اور مجاہدہ کے لفظ سے یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ بس نفس کو خوب بھوکا مارے نہ کھانے کو دے نہ پینے کو نہ اچھا کپڑا پہنے نہ کسی سے ملے جلے نہ کسی سے بات کرے بیوی بچوں کو بھی چھوڑ دے اور حقوق نفس کو

عہ چنانچہ مسلمۃ لاشیۃ فیہا کے بعد مذکور ہے ۱۲ منہ

بالکلیہ ترک کردے نہ لیٹے نہ سووے رات بھر جاگتا رہا کرے حالانکہ نفس کشتی کی یہ تفسیر بالکل
غلط ہے اور منشا اس غلطی کا یہ ہے کہ لوگ اس فن کو حاصل نہیں کرتے (یعنی فن تصوف کو جسمیں
مجاہدہ و اصلاح نفس سے بحث کیجاتی ہے ۱۲) اور نہ اسکی تحصیل کو ضروری سمجھتے ہیں حالانکہ یہ
بھی ایک فن ہے جیسے فقہ و حدیث ایک فن ہے جس طرح فقہ وغیرہ میں خاص اصطلاحات ہوتی ہیں
جنکو تحصیل فن ہی سے معلوم کیا جاسکتا ہے اسی طرح تصوف کی بھی اصطلاحات ہیں جو فقہ وغیرہ
کی اصطلاحات سے جُدا ہیں ان کی حقیقت بدون تحصیل فن کے واضح نہیں ہوسکتی اور تصوف
کی جُدا اصطلاحات ہونے سے میرا یہ مطلب نہیں کہ وہ شریعت سے بھی جدا ہیں نہیں بلکہ
فنون مدونہ کی اصطلاحات سے جُدا ہونا مراد ہے اور اگر وہ اصطلاحات شریعت سے بھی جدا
ہوتیں جب بھی مضائقہ نہ تھا لانہ لا مشاحۃ فی الاصطلاح آخر نحو و صرف وغیرہ
کی بہت سی اصطلاحات ہیں جنکو شریعت سے کوئی تعلق نہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ تصوف
کی اصطلاحات دو قسم پر ہیں ایک وہ جو مقاصد کے متعلق ہیں وہ تو شریعت سے الگ
نہیں ہیں بلکہ مقاصد میں اصطلاحات تصوف کی حقیقت وہی ہے جو شریعت میں مذکور ہے
اور دوسرے وہ اصطلاحات ہیں جو امور زوائد کے متعلق ہیں وہ شریعت سے جدا ہوسکتی ہیں
جیسے تجدد امثال۔ توحید وجودی شغل رابطہ وغیرہ مگر مجاہدہ و نفس کشی امور زوائد میں سے نہیں
ہے بلکہ مقاصد میں سے ہے کیونکہ یہ مامور بہ فی الشرع ہے نصوص ہیں جابجا مجاہدہ کا ذکر ہے۔
کہیں بصورت خبر کہیں بصیغۂ امر چنانچہ ارشاد ہے ومن جاھد فانما یجاھد لنفسہ۔
والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سُبُلنا۔ وجاھدوا فی اللہ حق جھادہ ط
وغیرہ وغیرہ پس اسکی تفسیر وہی ہونی چاہیے جو شریعت نے بتلائی ہے کیونکہ میں کہہ چکا ہوں
کہ مقاصد میں تصوف کی اصطلاحات شریعت کی اصطلاحات سے جُدا نہیں ہیں پس اس
غلطی کا منشا جہل کے سوا کچھ نہیں لوگوں نے کتابوں میں خاص خاص لوگوں کے مجاہدات کا
ذکر دیکھکر یہ سمجھ لیا کہ بس یہی اسکی حقیقت ہے حالانکہ حقیقت شے اور چیز ہے اور اس کا
طریق تحصیل دوسری شے ہے حقیقت ایک ہوا کرتی ہے اور طریق تحصیل مختلف بھی ہوسکتے
ہیں (مثلاً) بیماری میں پرہیز کرنا مضرات سے ضروری ہے لیکن اس سے یہ سمجھ لینا کہ پرہیز کی

حقیقت وہی ہے جو فلاں طبیب نے فلاں مریض کو تیار کی تھی کہ ۶ ماہ تک پانی نہ پیئے کسی سے میل جول اختلاط نہ کرے اور سوائے دو چپاتیوں کے کچھ نہ کھائے سخت غلطی ہے کیونکہ وہ طریقہ اسی مریض کے ساتھ مخصوص تھا سب کے لئے وہی طریقہ نہیں اور نہ پرہیز کی حقیقت اس طریقہ میں منحصر ہے خوب سمجھ لو ۱۲ جامع) پس لوگوں نے ایک غلطی تو یہ کی کہ مجاہدہ کی تفسیر اپنی طرف سے گھڑی - دوسری غلطی یہ کی کہ اس تفسیر مخترع کو نصوص میں جاری کیا اور یہ سمجھے کہ والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا وغیرہ میں یہی مجاہدہ مراد ہے جو ہمارے ذہن میں ہے اور یہ معنی طاقت سے باہر تھے تو کہنے لگے کہ دین پر عمل مشکل ہے چنانچہ یہ بات عام طور پر لوگوں کی زبان پر ہے حالانکہ اسمیں تکذیب ہے نصوص صریحہ کی حق تعالیٰ فرماتے ہیں لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا جسمیں تصریح ہے کہ دین میں طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دی گئی حدیث میں ہے الدین یسر کہ دین پر عمل کرنا آسان ہے اور فرماتے ہیں ما جعل علیکم فی الدین من حرج کہ خدا نے تمہیر دین میں کچھ بھی تنگی نہیں کی۔ مگر عوام اس غلطی کی بنا پر ان نصوص کی حقیقت سمجھنے سے قاصر ہیں اُن کی سمجھ میں نہیں آتا کہ دین آسان ہے بس یوں خیال کرتے ہیں کہ یہ خاص لوگوں کے واسطے آسان ہوگا سب کے واسطے آسان نہیں حالانکہ نص میں نفسا عام ہے جس سے معلوم ہوا کہ کسی کو بھی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دی گئی جسمیں عام وخاص کا کوئی تفرقہ نہیں نیز ما جعل علیکم فی الدین من حرج میں خطاب سبکو عام ہے۔ مگر لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کیونکہ وہ تو مجاہدہ والا اسکو سمجھتے ہیں جو بیوی بچوں کو چھوڑ دے اور نفس کے ضروری حقوق کو بھی ادا نہ کرے حالانکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ولقد ارسلنا رسلا من قبلک وجعلنا لھم ازواجا وذریۃ اور دوسری جگہ ارشاد ہے وما ارسلنا قبلک من المرسلین الا انھم لیاکلون الطعام ویمشون فی الاسواق ط اس سے معلوم ہوا کہ انبیا علیہ السلام کے بیوی اور بچے بھی ہوتے تھے اور وہ کھاتے پیتے بھی تھے اور بازار میں ضروریات کیلئے چلتے پھرتے بھی تھے اور ظاہر ہے کہ تمام ضروریات کی جڑ اولاد وازواج ہی ہیں ان کے لئے انسان کو سب سامان کرنا پڑتا ہے مگر باینہمہ انبیا علیہم السلام ان سے الگ تھے اور یہ مسئلہ متفق علیہ ہے کہ مجاہدہ میں انبیا سے زیادہ کامل کوئی نہیں ہو سکتا

پس ثابت ہو گیا کہ مجاہدہ کی یہ حقیقت ہرگز نہیں کہ بیوی بچوں سے الگ ہو جائے۔ اور ایک بڑی خرابی اس غلطی سے یہ پیدا ہوتی ہے کہ اس مجاہدہ مخترعہ میں اگر کوئی کامیاب ہو جائے تو پھر وہ اپنے کو دوسروں سے اکمل و افضل سمجھنے لگتا ہے اور جو لوگ اس طرح مجاہدہ نہیں کرتے اُن کو حقیر سمجھنے لگتا ہے حالانکہ اول تو اس امتیاز کا منشا وہ غلطی ہے جو اس نے مجاہدہ کی حقیقت سمجھنے میں کی ہے دوسروں کو اس غلطی میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے اور اگر تسلیم کر لیا جائے کہ مجاہدہ کی حقیقت اس نے صحیح سمجھی پھر بھی اسے اپنے کو افضل و اکمل سمجھنے کا کوئی حق نہیں کیونکہ دیکھنا یہ ہے کہ اسکو جو امتیاز حاصل ہے اُسکا منشا اس کا کوئی کمال ہے یا دوسروں کا نقص سو ظاہر ہے کہ مجاہدہ شرعاً مامور بہ ہے اور اسکے نزدیک مجاہدہ کی حقیقت وہی ہے جو اس نے اختیار کی تو اس صورت میں اس کا کمال کیا ہوا بلکہ جو کچھ اس نے کیا اپنے نزدیک مامور بہ کو ادا کیا اور مامور بہ کو ادا کر کے اپنے کو صاحب کمال سمجھنا سخت حماقت ہے کیونکہ یہ کوئی کمال نہیں یہ تو ایک ضروری فعل تھا جسکو اس نے ادا کیا باقی دوسروں سے امتیاز اسلئے ہو گیا کہ اور لوگ اس مامور بہ میں کوتاہی کر رہے ہیں تو اگر ہوا تو ان میں نقص ہوا اسمیں کیا کمال ہوا اسکی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص پانچ وقت کی نماز پڑھکر اپنے کو صاحب کمال سمجھے کیونکہ اتفاق سے یہ ایسی جماعت میں جا پھنسا ہے جو پانچ کی جگہ صرف دو ہی وقت کی نماز پڑھتے ہیں حالانکہ پانچ وقت کی نماز پڑھنا کوئی کمال نہیں یہ تو فی نفسہ ہر شخص پر ضروری ہے اگر اس سے کم کرے گا گنہگار ہو گا مگر امتیاز اسلئے ہو گیا کہ دوسرے لوگ اس واجب میں کوتاہی کر رہے ہیں اور صرف دو ہی وقت کی نماز پڑھتے ہیں تو اس سے کہا جائے گا کہ تمھارے اس امتیاز کا منشا تمھارا کوئی کمال نہیں بلکہ دوسروں کا نقص اس کا سبب ہو گیا ہے اسی طرح اس مجاہدہ کرنے والیکو سمجھنا چاہیئے کہ میری اس امتیاز کا منشا میرا کوئی کمال نہیں بلکہ دوسروں کا نقص اس کا سبب ہے تو اعتقاد کمال تو لغو ٹھیرا۔ رہا اوروں کے نقص کا اعتقاد تو وہ اسکے نزدیک نقص ہے یہ کہاں سے لازم آگیا کہ واقع میں بھی نقص ہے اور جو امر واقع میں بھی نقص ہو ممکن ہے کہ کوئی دوسرا کمال اسکی تلافی کر دے۔ ایک خرابی اس معنیٰ غلط کی یہ ہوئی کہ مجاہدہ کی یہ تفسیر سمجھنے کی وجہ سے ہر شخص اسکے لیئے جلدی فارغ نہیں ہوتا بلکہ کوئی پنشن کے انتظار میں رہتا ہے کوئی لڑکون کی شادی سے

فراغت کا منتظر ہے کہ بس ان کاموں سے فارغ ہو کر پھر دنیا سے الگ ہو جائیں گے خلاصہ یہ کہ ان کے نزدیک گھر کو تالا لگا دینا مجاہدہ ہے اسی لئے ایسے وقت کے منتظر رہتے ہیں جسمیں گھر کو تالا لگا کر بیٹھنا آسان ہو۔ گویا یہ شخص مجاہدہ اسکو سمجھتا ہے کہ ایسا بن جائے جسکو حدیث میں خالی عن الخیر کہا گیا ہے لا خیر فی من لا یالف ولا یؤلف یعنی اس شخص میں خیر نہیں جو نہ دوسروں سے مانوس ہو نہ دوسرے اس سے مانوس ہوں۔ سو حدیث سے معلوم ہو گیا کہ جسکو آجکل مجاہدہ والا سمجھا جاتا ہے اسکو حضور صلی اللہ علیہ وسلم لا خیر فرماتے ہیں۔ کہ اسمیں کچھ خیر نہیں تو وہ کمال کہاں ہوا بلکہ نقص ہوا۔ ہاں کسی معالجہ کی ضرورت اس سے مستثنے ہی۔ اسلئے میں نے کہا تھا کہ مجاہدہ کے معنی اپنی طرف سے نہ گھڑے جائیں بلکہ انتظار کیا جاوے اسکے معنی ابھی آتے ہیں اسی طرح نفس کشی کے لفظ سے اس کا ترجمہ کر کے اپنے ذہن میں کوئی حقیقت متعین نہ کریں کیونکہ نفس کشی یہ اصطلاحی لفظ ہے جو فارسی میں ترجمہ ہے مجاہدہ کا مولانا فرماتے ہیں ؎

نفس نتواں کشت الا ظل پیر   دامن آں نفس کش را سخت گیر

اس شعر سے میرا مقصود حصول مجاہدہ کا طریقہ بتلانا نہیں ہے کیونکہ اسکو تو میں آگے چلکر بیان کرونگا اسوقت صرف یہ بتلانا ہے کہ نفس کشی اصطلاحی لفظ ہے جو صوفیہ کے کلام میں مجاہدہ کیلئے بولا جاتا ہے چنانچہ اسی بنا پر شیخ کو نفس کش کہا جاتا ہے کہ وہ مجاہدہ کا طریقہ بتلاتا ہے اور عنقریب میں اسکی حقیقت بتلا دونگا اسی تفسیر سے یہ بھی واضح ہو جائیگا کہ مجاہدہ کی ضرورت سب کو ہے اور ہر وقت ہے یعنی اسکی ضرورت عام بھی ہے اور دائمی بھی ہے اور یہاں سے یعنی ضرورت مجاہدہ کے دوام سے بعض سالکین کی غلطی معلوم ہو گئی جو اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ چند روز مجاہدہ حسب قاعدہ طریق کر کے پھر اپنے کو فارغ سمجھ لیتے ہیں اور آئندہ کو مجاہدہ سے بیفکر ہو جاتے ہیں جسکی ابتدا انہماک فی المباحات سے ہوتی ہے کہ اول وہ مباحات میں زیادہ مشغول ہوتے ہیں پھر رفتہ رفتہ مکروہات میں انہماک ہونے لگتا ہے پھر محرمات کا ارتکاب بھی ہونے لگتا ہے اور چونکہ اس شخص کو ایک وقت تک حق تعالیٰ سے تعلق خاص رہ چکا ہے جو پہلے مجاہدہ کا اثر تھا تو اب اسکی یہ حالت زیادہ بری ہوتی ہے اسمیں نکس کا اندیشہ ہے

عه مرد در حدیث ۱۲

اور اسکی ایسی مثال ہو جاتی ہے جیسے کوئی عاشق مزاج شناس ہو کر محبوب کو ستانے لگے جو شخص مزاج شناس ہی نہیں ہوا اسکی حرکات اسدرجہ موجب عتاب نہیں ہوتیں جیسے مزاج شناس کی حرکات موجب عتاب ہوتی ہیں پس عارف جب مکروہات و محرمات کا ارتکاب کرتا ہے اسپر غیر عارف سے زیادہ قہر و غضب ہوتا ہے اور یہی نکس ہے (اعاذنا اللہ منہ)
اسلئے سالکین کو خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ مجاہدہ کی ضرورت دائمی ہے یہ چند روز کا کام نہیں بلکہ عمر بھر کا کام ہے۔ دیکھئے جس طرح بیماری میں دوا اور پرہیز کی ضرورت ہوتی ہے بیماری سے صحت کے بعد بھی تو پرہیز کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ صحت کے بعد زیادہ پرہیز کی ضرورت ہے کیونکہ بیماری میں تو معدہ خراب ہوتا ہے منہ کا مزا بدلا ہوا ہوتا ہے اسلئے مریض کو انواع و اقسام غذا کی خواہش خود بھی بہت کم ہوتی ہے اور اگر اس نے بدپرہیزی کی بھی تو بہت جلد ضرر کا احساس ہو جاتا ہے اور صحت کے بعد معدہ میں گونہ قوت آجاتی ہے بدپرہیزی سے معاً ضرر کا احساس نہیں ہوتا نیز اشتہا بھی ہر چیز کی ہوتی ہے تو اسوقت سنبھال کی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ بعض دفعہ صحت کے بعد بھی پھر مرض کا عود ہو جاتا ہے اور اطباء نے لکھا ہے کہ عودِ مرض ابتداء مرض سے زیادہ سخت ہوتا ہے اسی طرح عارفین نے فرمایا ہے کہ ابتدائی مجاہدہ کے بعد جب نفس اصلاح پذیر ہو جائے تو اسوقت مجاہدہ کی پہلے سے زیادہ ضرورت ہے کیونکہ ابتداء مجاہدہ میں تو بدپرہیزی کے ضرر کا احساس جلد ہو جاتا ہے نیز اسوقت چونکہ قوای نفسانیہ میں قوت ہوتی ہے اسلئے نفسانی خواہش کا تقاضا شدت کے ساتھ ہوتا ہے تو نفسانی خواہش پر تنبہ بھی جلد ہو جاتا ہے اور مجاہدہ سے فارغ ہونیکے بعد چونکہ تقاضای نفس کمزور ہو جاتا ہے اسلئے ہوای نفس کا احساس دیر میں ہوتا ہے مثلاً پہلے تو یہ حالت تھی کہ جہاں غیر محرم پر نظر پڑی فوراً احساس ہو گیا کہ اس نظر میں ہوائے نفس ملی ہوئی ہے اسلئے فوراً تنبہ ہو جاتا تھا اور مجاہدہ سے فارغ ہو کر جب غیر محرم پر نظر پڑتی ہے تو فوراً احساس نہیں ہوتا کہ اسمیں ہوائے نفس ملی ہوئی ہے کیونکہ اسوقت تقاضائے نفس کمزور ہے اب اسکو سوءِ نظر میں وہ ہیجان نہیں ہوتا جو پہلے ہوتا تھا اسلئے سالک اس غلطی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اس نظر میں ہوائے نفس نہیں ہے پھر وہ اس سے اجتناب کی کوشش بھی نہیں کرتا حتی کہ چند روز میں وہ سوءِ نظر کا

عادی ہو جاتا ہے نیز ابتدا میں اسکے ضرر کا احساس جلدی ہو جاتا تھا کیونکہ قلب میں کیفیات کا رسوخ نہیں ہوا تھا
ذرا سی بے اعتدالی سے کیفیت قلبی میں تغیر محسوس ہوتا تھا۔ مجاہدہ کے بعد چونکہ کیفیات قلبیہ میں رسوخ ہو چکا ہے تو اب
بعض اوقات کسی بد پرہیزی اور بے اعتدالی سے ضرر کا احساس جلدی نہیں ہوتا جس سے سالک
اس غلطی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اس فعل میں ہوائے نفس کو کچھ دخل نہیں ہے ورنہ میری قلبی
کیفیت میں ضرور فرق ہوتا پھر وہ اسکو غیر مضر سمجھکر اس سے بچنے کی کوشش نہیں کرتا اور نفس
کو ڈھیل دیدیتا ہے جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نفس اس فعل حرام کا عادی ہو جاتا ہے اور اب
کسی وقت سالک کو اس کے ضرر کا احساس بھی ہو جائے تو وہ بعض اوقات نفس کے روکنے پر
قادر نہیں ہوتا۔ کیونکہ ابتداء مجاہدہ میں جسطرح تقاضائے نفس شدید تھا ویسے ہی نفس میں
قوت کف بھی زیادہ تھی اور مجاہدہ کے بعد جس طرح تقاضائے نفس کمزور ہو گیا ہے اسیطرح
بعض مجاہدات سے قوت کف بھی کمزور ہو جاتی ہے کیونکہ مجاہدۂ اولیٰ سے تمام قویٰ میں ضعف پیدا ہو جاتا ۵ط
ہے اب آپکی سمجھ میں آیا کہ فراغ من المجاہدہ کے بعد مجاہدہ کی ضرورت پہلے سے زیادہ ہے کیونکہ اسوقت ہوائے نفس کا احساس ڈھیل ۱۲
دیر میں ہوتا ہے اسلئے استرسال ہوتا رہتا ہے اور استرسال کے بعد جب ہوائے نفس کا
احساس ہوتا ہے تو بعض دفعہ نفس کو روکنے پر قدرت نہیں پاتا کیونکہ اس شخص کی قوت
کف کمزور ہو چکی ہے اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ شہوت شیخ شہوت شاب سے اشد ہے
کیونکہ جوان کا نفس زندہ ہے اسکو شہوت کا احساس بھی جلد ہوتا ہے اور احساس کے بعد
اسمیں قوت کف بھی زیادہ ہے وہ اپنے نفس کو جلد ہوائے نفسانی سے روک سکتا ہے
اور شیخ کا نفس چونکہ مر چکا ہے اسلئے اسکو ہوائے نفس کا احساس جلد نہیں ہوتا بلکہ بہت
دیر میں ہوتا ہے تو اس حالت میں استرسال نفس زیادہ ہوتا ہے پھر اس ڈھیل کے بعد شیخ
کو ہوائے نفس کا جسوقت احساس ہوتا ہے تو اب وہ ضبط پر قادر نہیں ہوتا کیونکہ جسطرح اسکی
قوت شہوت کمزور ہے اسی طرح قوت ضبط بھی کمزور ہے اب وہ لاکھ کوشش کرے کہ
کسی طرح نفس کو سوء نظر سے روکوں مگر قدرت نہیں ہوتی۔ اور جوان کی جسطرح شہوت
کامل اور زندہ ہے اسی طرح اسکی قوت ضبط بھی کامل اور زندہ ہے اسی لئے جوان کو بوڑھے
سے زیادہ عفت پر قدرت ہے اور اسکی عفت شیخ کی عفت سے کامل بھی ہوتی ہے کیونکہ

نہ اُسکو زیادہ استمرار ہوتا ہے اور نہ استمرار کے بعد ضبط دشوار ہوتا ہے پس بڈھوں
کو مجاہدہ سے بےفکر نہ ہونا چاہیئے اُن کو جوانوں سے زیادہ پرہیز کی ضرورت ہے یہ مضمون
حق تعالیٰ نے بدون اعانت کتب کے قلب میں ڈالا تھا اور بحمداللہ علم عظیم عطا ہوا جسکی
قدر وہی لوگ کرینگے جنکو اس کا تجربہ ہوا ہو۔ ایکبار میں نے یہ مضمون سہارنپور میں بیان کیا تھا
اسوقت ایک بوڑھے میاں وعظ میں موجود تھے وہ اسکو سنکر بہت ہی روئے اسوقت
اُن کے سامنے اپنے استمرار نفس کا نقشہ کھنچ گیا تھا اور وہ سمجھ گئے کہ میں بہت بڑی
غلطی میں مبتلا تھا کہ اپنے کو مجاہدہ سے مستغنی سمجھتا تھا۔ اور اس مرض میں اکثر بوڑھے مبتلا ہیں
یہ لوگ اپنے کو مجاہدہ سے مستغنی سمجھتے ہیں حالانکہ بڑھاپے میں صرف جسم کمزور ہوتا ہے نفس کمزور
نہیں ہوتا بوڑھا کچھ کر تو نہیں سکتا مگر لالچ اور حرص اسکو جوانوں سے بھی زیادہ ہوتی ہے حدیث
میں ہے یشیب ابن آدم ویشب فیہ خصلتان الحرص وطول الامل یعنی انسان
بوڑھا ہو جاتا ہے مگر دو خصلتیں اُسمیں جوان ہوتی ہیں حرص اور طول امل اسلیئے بوڑھوں کو
اصلاح نفس کی جوانوں سے زیادہ ضرورت ہے۔ یہ مضمون تو ضمناً آگیا تھا میں یہ کہہ رہا تھا
کہ مجاہدہ کے بعد بھی مجاہدہ کی ضرورت رہتی ہے پس سالکین کان کھولکر سنلیں کہ مجاہدہ کی
ضرورت چند روزہ نہیں ہے بلکہ اسکی ضرورت دائمی ہے چند روزہ مجاہدہ کے بعد اگر تم نے
بدپرہیزی شروع کی تو یاد رکھو اسکے بعد عَودِ مرض اس شدت کیساتھ ہوگا کہ ہلاکت کے
قریب پہونچا دیگا پھر بہت کم ہیں جو اس ورطہ سے نجات پائیں اسی لئے مولانا فرماتے ہیں

اندریں رہ می تراش و می خراش ٭ تا دم آخر دمے فارغ مباش

تا دم آخر دمے آخر بود ٭ کہ عنایت با تو صاحب سر بود

یعنی اخیر دم تک اس راہ میں تراش و خراش ہی رہنی چاہیئے بس جب سلامتی کے ساتھ
موت آجائے گی اُسوقت مجاہدہ سے فراغت نصیب ہوگی۔ اسپر شاید کوئی یہ کہے کہ جب
مجاہدہ کے بعد بھی مجاہدہ کی ضرورت ہے تو پھر صاحب مجاہدہ وغیر صاحب مجاہدہ میں
کیا فرق ہوا۔ اس کا جواب اوپر کی تقریر میں آچکا ہے یعنی دونوں میں وہی فرق ہے جو
بیمار کے پرہیز میں اور بیماری سے صحت پانیوالے کے پرہیز میں فرق ہوتا ہے کہ پرہیز کی

ضرورت بیمار کو بھی ہے اور صحت پانیوالے کو بھی مگر ظاہر ہے کہ بیمار کو سخت ضرورت ہے اور اُس کا پرہیز بھی سخت ہوتا ہے اور صحت پانیکے بعد گو قدرے پرہیز کی ضرورت رہتی ہے مگر اب اتنا سخت پرہیز نہیں ہوتا جتنا بیماری کی حالت میں تھا تو کیا یہ فرق تھوڑا ہے کہ غیر صاحب مجاہدہ بیمار ہے اور صاحب مجاہدہ تندرست ہے بیمار ہر وقت خطرہ میں ہے اور تندرست خطرہ سے نکل چکا ہے البتہ تندرستی کے بعد جسطرح حکیم کہدیا کرتا ہے کہ اب تمکو ہر چیز سے تو پرہیز کی ضرورت نہیں صرف فلاں فلاں اشیاء سے پرہیز رکھنا کیونکہ وہ تمھاری طبیعت کے خلاف ہیں اسی طرح صاحب مجاہدہ کو یہاں کہا جاتا ہے کہ تمکو بالکل بیفکر نہونا چاہیئے بلکہ تھوڑا بہت پرہیز اب بھی کرنا چاہیئے جو کچھ دشوار پرہیز نہیں ہے بلکہ معمولی اور سہل ہے۔ دوسرا مضمون قربانی کے متعلق ہے اور اسکو مجاہدہ سے خاص تعلق ہے کیونکہ جملہ اعمال میں دو چیزیں ہیں ایک روحِ عمل دوسری صورتِ عمل بعبارت دیگر یوں کہنا چاہیئے کہ ہر عمل میں ایک باطن ہے اور ایک ظاہر ہے اب سمجھو کہ قربانی میں بھی ایک روح یعنی باطن ہے اور ایک صورت یعنی ظاہر ہے صورتِ قربانی تو اراقت دم (خون بہانا) ہے اور باطن قربانی مجاہدہ اور نفس کشی ہے۔ مگر یہاں یہ بات سمجھنے کے قابل ہے کہ باطن کی دو قسمیں ہیں ایک وہ باطن جو ظاہر کے ساتھ مقید ہے یہ باطن بدون ظاہر کے معتبر نہیں۔ دوسرا وہ باطن ہے جو ظاہر کے ساتھ مقید نہیں بلکہ اُسکے لئے لازم ہے اس باطن کا تحقق بدون ظاہر خاص کے بھی ہو سکتا ہے کیونکہ لازم کبھی عام ہوتا ہے تو وہ بلزوم کے بغیر متحقق ہو سکتا ہے اور باطن قسم اول کا تحقق بدون اُسکے ظاہر کے نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ ظاہر کے ساتھ مقید ہوتا ہے یہاں سے ملاحدہ کا اشکال مندفع ہو گیا جو ظاہر کو مطلقاً لغو اور فضول قرار دیکر ہر عمل میں صرف باطن پر اکتفا کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ جب ہر عمل میں ایک روح ہے اور ایک صورت ہے اور روح ہی مقصود ہے تو اس سے صورت کا مقصود نہونا لازم آگیا مگر یہ اُن کی غلطی ہے کیونکہ روح کے مقصود ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ صورت ہمیشہ غیر مقصود ہوا کرے بلکہ بعض دفعہ روح مع الصورت مقصود ہوا کرتی ہے چنانچہ انسان میں ایک روح ہے اور ایک اُسکی صورت یعنی جسم ہے روح کا مقصود ہونا تو ظاہر ہے چنانچہ

کسی کا بیٹا مر جاوے تو موت کے بعد گو جسم ہماری سامنے موجود رہتا ہے مگر روح کے فقدان سے مقصود فوت ہو جاتا ہے اب اُس جسم کے بقار سے کچھ تسلی نہیں ہوتی بلکہ اُسکو اپنے ہاتھوں زمین میں دفن کر کے اپنے سے جدا کر دیا جاتا ہے اس سے تو روح کا مقصود ہونا معلوم ہوا مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جسم بالکل مقصود نہو بلکہ حقیقت یہ ہے کہ روح اس قید کے ساتھ مقصود ہے کہ اس جسم کے ساتھ متصل ہو اگر روح ہماری سامنے موجود ہو مگر جسم کیساتھ اُس کا اتصال نہو تو اس صورت میں بقار روح سے کچھ خوشی اور تسلی نہیں ہو سکتی چنانچہ اگر کوئی شخص اپنی روح کو دوسرے جسم میں منتقل کر دے اور یہ بات مشق سے حاصل ہو جاتی ہے کیونکہ روح کا بدن کیساتھ محض تدبیر و تصرف کا تعلق ہے اور حقیقت میں وہ جسم سے منفصل ہے جو لوگ خاص تصرفات کے عادی ہیں اُن کو روح کا جسم سے انفصال محسوس ہوتا ہے یہانتک کہ مشق کر کے بعض دفعہ ایسا شخص اپنی روح کو حقیقۃً اپنے جسم سے منفصل کر دیتا ہے اور دوسرے جسم میں منتقل کر دیتا ہے تو اگر کوئی شخص ایسی مشق کر کے اپنی روح کو کتے اور بندر کے جسم میں منتقل کر دے اور اُسکے باپ کو معلوم ہو جائے کہ اس کتے یا بندر میں میرے بیٹے کی روح ہے تو کیا وہ اسوقت بھی اُسکی ساتھ وہی برتاؤ کرے گا جو جسم اصلی کے اتصال کے وقت کرتا تھا ہرگز نہیں بلکہ اب تو وہ اُسکو اپنا بیٹا کہنا بھی گوارا نکریگا نہ اُسکو شفقت و محبت سے پیار کریگا نہ اُسکو اپنے ساتھ بٹھلا کر کھلانا پلانا گوارا کریگا اور اگر کسی کو اسی طرح سے نقل روح میں تردد ہو اور یہ بات اُسکی سمجھ میں نہ آتی ہو تو وہ یوں سمجھے کہ جسوقت بنی اسرائیل میں سے ایک جماعت کو مسخ کیا گیا ہے جنمیں بعضے بندر بنگئے تھے اور بعضے سور ہو گئے تھے اور تین دن تک وہ اسی صورت میں رہے اور یہ جو مشہور ہے کہ اسوقت جتنے بندر اور سور ہیں سب اُنہی کی نسل میں ہیں یہ غلط ہے کیونکہ مسلم کی صحیح حدیث میں ہے کہ وہ لوگ تین دن کے بعد ہلاک ہو گئے تھے کوئی مسخ شدہ قوم تین دن کے بعد زندہ نہیں رہی اور نہ اُن سے کوئی نسل چلی ہے بلکہ اسوقت کے بندر اور سور اُن بندروں اور سوروں کی نسل سے ہیں جو بنی اسرائیل کے مسخ سے پہلے موجود تھے کیونکہ ان حیوانات کا وجود پہلے بھی تھا۔ بہرحال حدیث سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ مسخ کے بعد تین دن تک وہ لوگ زندہ رہے تو اب بتلائیے کہ اس مدت میں روح تو

یقیناً وہی تھی جو تین دن پہلے قالب انسان میں تھی مگر اسوقت وہ بندر یا سور کے قالب میں
تھی اور یقیناً انمیں بعض صاحب اولاد بھی تھے اہل وعیال بھی رکھتے تھے بعضوں کے باپ دادا
بھی زندہ ہوں گے تو کیا کوئی شخص ان کے مسخ ہونیکے بعد روح کے باقی رہنے کو کافی سمجھ سکتا
تھا اور کیا کسی کو یہ خوشی ہوسکتی تھی کہ میرا بیٹا زندہ تو ہے گو بندر اور سور کے قالب میں ہے
یا اُن کی اولاد اور بیبیاں اس صورت میں اپنے باپ یا شوہر کے زندہ رہنے سے خوش ہوسکتے
تھے کہ خیر روح تو موجود ہے گو جسم کیسا ہی ہو ہرگز نہیں بلکہ یقیناً مسخ ہونیکے ساتھ ہی اُن میں رونا
پٹینا پڑگیا ہوگا اور وہ اُسی وقت سے اُن کو مثل مردہ کے سمجھ چکے ہوں گے ہرگز کسی کو بھی ایں
اپنا باپ یا بیٹا یا شوہر کہنا گوارا نہوا ہوگا (اور اگر کسی کو یہ تردد ہو کہ واقعہ مدت دراز کا ہے
نمعلوم اُسوقت کے آدمیوں نے ان بندروں اور سوروں کے ساتھ کیسا معاملہ کیا ہوگا
شاید اُن لوگوں نے بقار روح کی وجہ سے ان کی ساتھ آدمیوں ہی کا سا معاملہ کیا ہو تو میں
ان ملحدین سے پوچھتا ہوں کہ تم ایمان سے کہو کیا تمکو اپنی اولاد اور بیوی بچوں کا بندر اور
سور ہو جانا گوارا ہے اور کیا تم بقار روح کی وجہ سے جو کہ تمھارے نزدیک اصل مقصود ہے اُسوقت
بھی اُن کی ساتھ وہی برتاؤ کروگے جو صورت انسانی میں کرتے تھے جہانتک میں سمجھتا ہوں
اسکو کوئی انسان ہرگز گوارا نکریگا پھر آخر اس ناگواری کی وجہ کیا ہے جب تمھارے نزدیک
محض روح مقصود ہے اور صورت محض لغو وفضول ہے تو یہاں تم اس قاعدہ پر کیوں نہیں
چلتے اور اپنا اور اپنے اہل وعیال کا سور بندر بن جانا تمھیں کیوں ناگوار ہے آخر روح تو جب بھی
موجود رہے گی ۱۲ جامع) پھر حیرت ہے مجھے ان ملحدین کی عقل پر کہ انھوں نے اعمال شرعیہ
میں مطلقاً روح کو کیونکر کافی سمجھا اور ظاہر کو مطلقاً کیسے فضول قرار دیدیا حالانکہ امور دنیویہ
میں وہ ادنیٰ ادنیٰ چیزوں کی صورت کو بیکار نہیں سمجھتے بلکہ روح کی ساتھ صورت کو بھی مقصود
سمجھتے ہیں۔ دیکھئے گنا چوسنا مقصود ہے مگر اس قید کے ساتھ کہ اُسکو منہ میں دبایا جائے اور
پوری پوری کا رس تدریجاً چوسا جائے حالانکہ گنے میں ایک ظاہر ہے ایک باطن ۔ باطن تو وہ میٹھا رس
ہے جو اُسکے اندر ہے اور ظاہر وہ جسم ہے جسکو پوری پوری کرکے چوسا جاتا ہے اب اگر کوئی
شخص اپنے نوکر یا دوست سے کہے کہ میں سہارنپور کا گنا چوسنا چاہتا ہوں اور وہ اُس کے

سامنے سہارنپور ہی کے گنّے کی شکر لاکر رکھدے کہ اسکو پھانک لیجئے یہ اُسی گنے کی روح ہے
جسے آپ چوسنا چاہتے ہیں تو کیا وہ اسکو کافی سمجھیگا اور شکر پھانک لینے کو گنّا چوسنے کا
قائم مقام سمجھیگا ہرگز نہیں بلکہ یہ کہیگا کہ مجھے گنّا چوسنا اُسکی خاص صورت کے ساتھ مطلوب
ہے شکر کا پھانکنا اس مقصود کے قائم مقام نہیں ہوسکتا جو لطف گنے کے چوسنے میں ہے
وہ گڑ کھانے اور شکر پھانکنے میں کہاں ہے پھر حیرت ہے کہ یہاں تو صورت بھی باطن کیساتھ
مطلوب ہو اور اعمال شرعیہ میں صورت مطلوب نہو بس ملحدین کا یہ کہنا کہ نماز کی روح ذکر اللہ ہے
بس قلب میں ذکر اللہ کا ہونا کافی ہے صورت صلوٰۃ کی کچھ ضرورت نہیں اور روزہ کی روح شہوت
نفسانی کا توڑنا ہے اگر کسی اور طریقہ سے شہوت نفس شکستہ ہوجائے تو روزہ کا مقصود
حاصل ہوگیا صورت صوم کی کچھ ضرورت نہیں زکوٰۃ سے مقصود نفس کو صفت بخل سے پاک کرنا ہی
اگر کسی میں طبعی طور پر بخل نہو تو اسکو صورت زکوٰۃ کی ضرورت نہیں یا حج سے مقصود عشق کا حال
پیدا کرنا ہے اگر کسی اور طریقہ سے یہ حال پیدا ہوجائے تو پھر حج فرض نہیں یہ بالکل غلط ہی کیونکہ
ہم کہیں گے کہ ان اعمال کی جو تمنے روح بیان کی ہے وہ صورت کیساتھ مقید ہے اور ان میں روح
مع الصورت مطلوب ہے مجرد روح بلا صورت معتبر نہیں (جیسا کہ کھانے کی روح تو بھوک کا
دفع کرنا اور پیٹ بھرنا ہے مگر اسکی ساتھ روٹی اور سالن کی صورت بھی مطلوب ہوتی ہے اگر
صورت مطلوب نہیں تو پھر ان ملحدین کو گیہوں چبانا اور آٹا پھانک لینا چاہئے کیونکہ روح
اکل تو اسمیں بھی موجود ہے ۱۲) غرض ثابت ہوگیا کہ بعض دفعہ روح مع الصورت مطلوب
ہوا کرتی ہے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے ایک شخص نے نماز کے متعلق کہا
کہ اس اٹھک بیٹھک سے کیا ہوتا ہے مقصود تو اور ہی کچھ ہے حاجی صاحب نے فرمایا کہ اسی میں
کچھ ہے اور اسکے بغیر تمھارے مراقبے اور مجاہدے سب فضول ہیں اور یہ باطن کی پہلی قسم ہے
جو ظاہر کے ساتھ مقید ہے یہ باطن بدون ظاہر کے معتبر نہیں اور ایک باطن ان اعمال
میں قسم دوم کا ہے مثلاً نماز کے لئے مطلق ذکر جو دوسرے مادہ میں بھی متحقق ہوتا ہے اور
روزہ کے لئے مطلق کسر شہوت جو دوسرے مادہ میں بھی متحقق ہوتا ہے اور میں نے باطن کے
متعلق یہ تفصیل اور تقسیم اسلئے بیان کردی تاکہ کسی کو ضحیۃ کے متعلق میرے اس قول سے

کہ اُس کا ایک ظاہر ہے ایک باطن ہے یہ وہم نہ پیدا ہو کہ یہ تو وہی بات ہے جو ملحدین کہا کرتے ہیں اس تفصیل سے انشاء اللہ یہ وہم رفع ہو گیا ہو گا کیونکہ میں نے بتلا دیا کہ ہمارے نزدیک باطن کی ایک قسم وہ بھی ہے جو ظاہر کے ساتھ مقید ہے اور ملحدین کے نزدیک کوئی قسم ایسی نہیں یہ فرق ہے اُن میں اور صوفیہ میں۔ اب سنئے کہ اسی طرح قربانی میں ایک تو صورت ہے یعنی اراقت دم (خون بہانا) یہ قربانی کی صورت ہے گوشت خیرات کرنیکا نام قربانی نہیں گوشت تو چاہے تم سارا کھالو ذرا سا بھی خیرات نہ کرو تو قربانی میں کچھ نقصان نہیں آتا بس قربانی تو خون بہانیکا نام ہے اور یہ اُس کا ظاہر ہے۔ اور ایک اُسکی رُوح اور باطن ہے وہ مجاہدۂ نفس کشی ہے کیونکہ یہ شخص مال خرچ کرکے جانور کو خریدتا ہے اور نفس کو اپنی چیز کا ہلاک کرنا گران ہے تو یہ اپنے نفس کے داعیہ کو دباتا ہے اور اسکے محبوب کو فنا کرکے اُسپر زخم لگاتا ہے یہی مجاہدہ ہے اور اس درجہ کا نام اصطلاح میں فنا ہے اسکے آگے ایک اور درجہ ہے وہ یہ کہ قربانی سے مقصود رضائے حق ہے یہ شخص اپنے مال کو فنا کرکے رضائے حق کا طالب ہے ثواب کا قصد کرتا ہے اس کا نام اصطلاح میں بقا ہے کیونکہ مال خرچ کرنے سے نفس میں جو انحلال ہوا اور زخم لگا تھا وہ حصول ثواب اور تصور رضائے حق سے مندمل ہو جاتا ہے قربانی کرتے ہوئے جو قلب کو صدمہ اور کلفت ہوئی تھی وہ اب مبدل بسرور و راحت ہو جاتی ہے پس یہ حالت اُس حالت کی مقابلہ میں بقا کے مشابہ ہے پس معلوم ہوا کہ قربانی کی روح فنا و بقا ہے مگر یہ فنا و بقا جو کہ باطن ہے اضحیہ کا یہ بھی دو قسم ہے ایک وہ جو مخصوص ہے قربانی کے ساتھ دوسرا مطلق فنا و بقا جو دوسرے مواد میں بھی متحقق اور ہر عمل میں مطلوب ہے میں نے اوپر اسی کو مجاہدہ کہا ہے اور جس مجاہدہ کا مجکو یہاں بیان کرنا مقصود ہے وہ قسم دوم ہے اسکی یعنی مطلق مجاہدہ جسکا تعلق ہر عمل سے عام ہے اور قربانی کے ساتھ اوروں سے زیادہ اسلئے قربانی کی مناسبت محرک ہوئی بیان مجاہدہ کی اب یہ سمجھئے کہ اس فنا و بقا میں جسکی مختصر تعبیر مجاہدہ سے کیگئی ہے۔ اصل مقصود بقا ہے اور فنا اُسکے لئے ذریعہ ہے اس بنا پر کہا جاویگا کہ باطن اضحیہ حیوۃ نفس ہے مگر حیوۃ سے وہ حیوۃ طیبہ مراد ہے جو فنا نفس کے بعد حاصل ہوتی ہے یعنی بقا جسکے متعلق حق تعالیٰ فرماتے ہیں من عمل صالحا من ذکر او انثیٰ وھو مؤمن فلنحیینہ حیوۃ طیبۃ۔ وہ حیوۃ ہوتی

مراد نہیں جو فنا سے پہلے ہوتی ہے کیونکہ حیات ناسوتی ہر شخص کی طیبہ نہیں ہوتی بلکہ بعض کی حیات معیشت ضنک (یعنی تنگ زندگی) ہوتی ہے چنانچہ ایک شخص سے کسی نے پوچھا کہ تمھارے گھر خیریت ہے تو وہ بہت خفا ہوا اور کہا تم مجھے کوستے ہو خیریت ہوگی تمھارے یہاں کہ نہ کچھ آگے کو نہ پیچھے کو ہمارے یہاں خیریت کیوں ہوتی کہ ماشاء اللہ بیٹوں پوتوں بہو بیٹیوں سے گھر بھرا ہوا ہے آج کسی کے سر میں درد ہے کسی کے پیٹ میں درد ہے کسی کو بخار آتا ہے کسی کو دست آرہے ہیں کسی کے چوٹ لگ گئی ہے تو ہمارے یہاں جب اتنا کنبہ ہے وہاں خیریت کیوں ہونے لگی خیریت تم جیسوں کے یہاں ہوگی جسکے اولاد نہ بہنیا د سارے گھر میں اکیلے پڑے رہتے ہیں واقعی دنیا داروں کو چین کہاں مگر وہ ان تعلقات میں ایسے منہمک ہوتے ہیں کہ انکا مذاق بھی بدلجاتا ہے وہ ان تعلقات کو جو حقیقت میں عذاب ہیں راحت سمجھتے ہیں اور راحت کو کلفت. چنانچہ اس شخص نے خیریت کے سوال کو کوسنا سمجھا اور صاف کہدیا کہ ہمارے یہاں اللہ نکرے جو خیریت ہو خیریت تمھارے یہاں ہوگی اہل دنیا قیود و علائق میں خود پھنستے جاتے ہیں جسکے ساتھ خدا نے کوئی بھی قید اور تعلق نہ لگایا ہو وہ خود اپنے سر زار جھگڑے باندھ لیتا ہے وہی حال ہے ان کا غم نداری بز بخر مگر اسوقت تو بوجہ مذاق بدلجانے کے انکو ان تعلقات و قیود کی کلفت کا زیادہ احساس نہیں ہوتا گو حقیقت اب بھی معلوم ہے ایسا بیجس کوئی نہیں ہو سکتا جسکو کلفت کا کلفت ہونا بھی معلوم نہو مگر چونکہ زیادت انہماک سے اب انکی عادت ہوگئی ہے اسلئے تکلیف کا احساس نہیں ہوتا (جیسے کسی شخص کے دو تین سال تک کھجلی رہے تو عادت کی وجہ سے اسکو کلفت کا احساس اتنا نہیں ہوتا جتنا ابتدا میں تھا اب اُسے ہر وقت کھجلانے ہی میں مزا آتا ہے مگر حقیقت تو اُسے بھی ضرور معلوم ہے ۱۲ جامع) مگر جب اہل دنیا مرنے لگتے ہیں اُسوقت حقائق پوری طرح منکشف ہوتی ہیں اور اُن کا عذاب ہونا معلوم ہوجاتا ہے اسوقت تو وہ ان تعلقات سے خوش نظر آتے ہیں اور آزاد لوگوں پر ہنستے ہیں مگر جب پردہ اُٹھے گا اُسوقت معلوم ہوگا کہ جن تعلقات سے ہمنے دل لگایا تھا وہ مار آستین تھے بس وہی قصہ ہوگا ؎

کہ با کہ باختہ عشق در شب دیجور +

کوئی شخص اندھیری رات میں کسی عورت سے مشغول ہوا اُسوقت تو وہ یہ سمجھکر خوش ہوتا رہا کہ

میں حسین پری پیکر کو بغل میں لئے ہوئی ہوں مگر جب صبح ہوئی اسوقت معلوم ہوا کہ ساری رات ایک بڑھیا چڑیل کے ساتھ مشغول رہا تھا اب اسکی حسرت قابل دید ہے کہ وہ اپنے اوپر ہزار نفریں کرتا ہے اور رات کے قصہ کو یاد کر کے اسے خود قے آتی ہے خوب کہا ہے ؂

فسوف تری اذا انکشف الغبار ۔۔۔ افرس تحت رجلك ام حمار

ایک شخص آندھی غبار میں گدھے پر سوار ہے اور کہتا ہے کہ میں گھوڑے پر سوار ہوں دوسرا شخص متنبہ کرتا ہے کہ کمبخت تو گھوڑے پر سوار نہیں بلکہ گدھے پر سوار ہے مگر وہ ایک نہیں سنتا اور ناصح کو بیوقوف بتلاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ اچھا بھائی تو یہی سمجھتا رہ ابھی غبار کھلنے پر تجھے معلوم ہو جائیگا کہ تیرے ران کے نیچے گھوڑا ہے یا گدھا۔ اسی طرح جو لوگ تعلقات دنیا میں پھنسکر خوش ہیں اور ان کو راحت سمجھتے ہیں ان سے عارفین یہی کہتے ہیں فسوف تری اذا انکشف الغبار + حق تعالیٰ اہل دنیا کے ان ہی تعلقات کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں فلا تعجبك اموالھم ولا اولادھم انما یرید اللہ لیعذبھم بھا فی الحیوۃ الدنیا وتزھق انفسھم وھم کفرون ٥ یعنی اے مخاطب تجھے ان منافقین کے اموال واولاد (اور دنیوی ترقی وعروج ۱۲) اچھے نہ معلوم ہونے چاہئیں کیونکہ حق تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ ان کے ذریعے سے انکو عذاب دیں۔ واقعی اہل دنیا کیلئے تو مال واولاد عذاب ہی ہے کیونکہ ان کو ان چیزوں سے تعلق اسقدر ہوتا ہے کہ مارے فکر کے رات دن نیند نہیں آتی ہر وقت اسی جوڑ توڑ میں لگے رہتے ہیں کہ آج اتنے روپئے ہیں کل کو اتنے ہو جائیں گے فلاں پر اتنا قرض ہے اس کا اتنا سود آئیگا۔ رات کو سوتے ہیں تو روپیوں کے فکر سے بار بار آنکھ کھلجاتی ہے تو یہ خاک راحت ہو وبال جان ہی ہے بعضوں کو اولاد سے ایسا ہی تعلق ہوتا ہے ان کے لئے کبھی زمین خریدتے ہیں کبھی باغ لگاتے ہیں کبھی جائداد بڑھاتے ہیں جسمیں سیکڑوں مقدمے کرنا پڑتے ہیں وصول باقی کے لئے رات دن نالشیں ہوتی ہیں گرمی اور برسات میں مصیبت کے ساتھ سفر کرتے ہیں پھر ذرا کسی بچہ کا کان گرم ہو گیا تو بھاگے بھاگے پھرتے ہیں نہ کھانیکے نہ پینے کے نہ نماز کے نہ روزہ کے ہر وقت فکر میں گھلے جاتے ہیں مسلمان کو تو خدا پر کبھی نظر ہوتی ہے کافر تو ہر وقت بے چین رہتا ہے اسلئے فرماتے ہیں کہ ہم اموال واولاد سے ان منافقین کو

دنیا میں عذاب دینا چاہتے ہیں تو یہ کیا تھوڑا عذاب ہے اور یہ عذاب دنیا میں ہی ہوتا ہے آخرت کا عذاب الگ ہے پس انما یرید اللہ ان یعذبھم بھا میں دنیوی عذاب ہی مراد ہے آخرت کا عذاب مراد نہیں کیونکہ جس کا ذکر دوسرے جملہ میں ہے وتزھق انفسھم وھم کفرون یعنی ہم چاہتے ہیں کہ یہ لوگ ساری عمر انہی تعلقات میں گرفتار رہیں ان سے خلاصی نصیب نہو حتی کہ اس حالت میں انکو موت آجاوے اور کافر ہو کر مریں۔ تو کفر کی حالت میں مرنا یہ آخرت کا عذاب ہے۔ اسلئے یعذبھم بھا میں دنیوی عذاب مراد ہونا چاہیئے ورنہ جملہ ثانیہ کو پہلے کی تاکید ماننا پڑے گا اور تاسیس تاکید سے اولی ہے دوسرے اموال واولاد کا دنیا ہی میں وبال جان ہونا مشاہد ہے یہ بھی اسکو مقتضی ہے کہ اس عذاب کا بھی آیت میں ذکر ہو۔ تیسرے عذاب آخرت کا ذکر تو موت علی الکفر کے بعد ہونا مناسب ہے کیونکہ وہ موت کے بعد ہی ہوگا اور یہاں ذکر موت سے پہلے عذاب کا ذکر ہے تو ظاہر یہی ہے کہ اس سے دنیوی عذاب مراد ہے فلا تعجبك اموالهم ولا اولادهم انما يريد الله ان يعذبهم بها في الحيوة الدنيا آیت میں تو فی الحیوۃ الدنیا کی قید خود ہی مذکور ہے میں نے خواہ مخواہ اتنی کوشش کی عذاب دنیوی کے مراد لینے میں یہاں تو تصریح ہے کہ اللہ تعالی ان اموال واولاد سے حیوۃ دنیا میں بھی ان کو عذاب دینا چاہتے ہیں مجھے فی الحیوۃ الدنیا کا لفظ یاد نہ رہا عجیب بات ہے حالانکہ بحمد اللہ میں حافظ بھی ہوں مگر خیر کچھ حرج نہیں اس تقریر سے یہ فائدہ ہوا کہ یہ مسئلہ نقلاً و عقلاً دونوں طرح ثابت ہو گیا اگر آیت میں فی الحیوۃ الدنیا کی قید نہ بھی ہوتی جب بھی دلائل سے یہاں عذاب دنیا کا مراد ہونا ثابت ہوتا تو اس جملہ کے بھول جانے میں بھی فائدہ ہی ہوا کہ حق تعالی نے وہ دلائل قلب میں القا فرما دیئے جنسے اس قید کی ضرورت وحکمت معلوم ہو گئی بہر حال نص سے ثابت ہو گیا کہ یہ تعلقات حقیقت میں عذاب ہیں گو فساد مذاق کی وجہ سے کسی کو اسکا احساس نہو علامہ غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اہل علائق کو مرتے وقت سخت تکلیف ہوتی ہے اور چونکہ مرنیکے بعد بھی روح کو ان چیزوں سے تعلق رہتا ہے جنسے دنیا میں تعلق تھا بلکہ موت کے بعد بوجہ قوت ادراک کے یہ تعلق قوی ہو جاتا ہے تو مفارقت جسم کے بعد روح کو ان علائق کی مفارقت سے ایسی اذیت ہوتی ہے جیسے عذاب جہنم اس کا یہ مطلب نہیں کہ عذاب قبر اور عذاب

جہنم کی حقیقت یہی اذیت روحانی ہے جیسا کہ فلاسفہ نے سمجھا ہے بلکہ علامہ غزالی کا مطلب یہ ہے کہ عذاب قبر و عذاب جہنم کے علاوہ اہل علائق کو ان تعلقات کی مفارقت سے بھی سخت اذیت ہوتی ہے اور وہ اذیت عذاب جسمانی سے ہزرجہا زائد ہے بلکہ اسکو یوں سمجھنا چاہیے کہ جس طرح نعیم جنت اعمال صالحہ و علائق محمودہ کی صورت ہے اسی طرح عذاب قبر و عذاب جہنم اعمال سیئہ و علائق مذمومہ کی صورت ہے لیکن اس سے عذاب جسمانی کی نفی لازم نہیں آتی اور جن لوگوں نے علامہ غزالی کے کلام کا یہ مطلب سمجھا ہے وہ غلطی پر ہیں امام کا یہ مطلب ہرگز نہیں اور اہل اللہ چونکہ آزاد ہوتے ہیں اسلیئے اُن کی روح اس اذیت سے محفوظ ہے اہل اللہ کو صرف ایک قید ہے یعنی فکر آخرت مگر یہ قید خود لذیذ ہے جس سے وہ خلاصی نہیں چاہتے وہ قید تو اس کا مصداق ہے ؎

اسیرش نخواہد رہائی ز بند　　　　شکارش نجوید خلاصی از کمند

اور قدسی فرماتے ہیں ؎

مصلحت نیست مرا اسیری ازاں آب حیات　　　　ضاعف اللہ بہ کل زمان عطشی

اور مولانا فرماتے ہیں ؎

گر دو صد زنجیر آری بگسلم　　　　غیر زلف آن نگار مقبلم

اہل اللہ کو علائق دنیا میں انہماک نہیں ہوتا اور نہ ان کے قلب کو اُن سے لگاؤ ہوتا ہے اگر ظاہر میں عارف علائق میں مشغول بھی ہو تو اُس کا قلب اُن سے فارغ ہوتا ہے چنانچہ ایک شخص نے حضرت خواجہ عبید اللہ احرار کا امتحان لینا چاہا کیونکہ اُن کے یہاں حشم خدم اور ساز و سامان بہت کچھ تھا تو اس شخص نے خیال کیا کہ یہ تو بظاہر بہت ہی مشغول ہیں شاہی کارخانہ اور امیرانہ انتظام ہے دیکھوں ان کا باطن کیسا ہے تو اس نے ایک دن آکر عرض کیا کہ حضرت میں حج کو جانا چاہتا ہوں اور دل چاہتا ہے کہ آپ کی ہمراہ چلوں فرمایا بسم اللہ چلو اور یہ کہکر فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اس شخص نے عرض کیا کہ حضرت آپ تو بہت ہی جلدی تیار ہو گئے اس کارخانہ کا تو کچھ انتظام کر دیجئے فرمایا یہ کارخانہ میرا تھوڑا ہی ہے حق تعالیٰ کا ہے وہ خود انتظام کر لیں گے میرے اوپر انکا کام اٹکا ہوا نہیں ہے جب میں نہوں گا وہ کسی دوسرے سے

یہ کام لے لینگے اب تو شاہ صاحب کی آنکھیں کھل گئیں کہنے لگے کہ تھوڑا سا توقف فرمایئے میں
ذرا گھر سے کمبل لے آؤں فرمایا بس اسی برتے پر امتحان لینے آئے تھے میں نے تو اتنے بڑے
کارخانہ پر بھی نظر نکی اور تم ایک کمبل سے بھی نظر قطع نکر سکے تو بات یہ تھی کہ اُن کے دلکو ایک کے
سوا کسی سے تعلق نہ تھا اور اس ایک قید کے سوا اُن کو کوئی قید نتھی اب لوگ اس قید سے
تو آزادی چاہتے ہیں جو لذیذ ہے اور اُن قیود کو خریدے پھرتے ہیں جو مصیبت ہیں۔ شاید
یہاں کسی کو شبہ ہو کہ انبیاء علیہم السلام کو جب دنیوی اسباب سے تعلق نہیں ہوتا تو چاہئے تھا کہ
مفارقت سہل ہو پھر انکا نزع کیوں شدید ہوتا ہے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نزع میں
بہت شدت ہوئی حتی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور کی شدت نزع دیکھکر
میں کسی کی سہولت نزع دیکھکر اُسکی تمنا نہیں کرتی اسی طرح بعض اولیاء کو بھی نزع شدید ہوتا ہے
اسکی کیا وجہ ہے تو بات یہ ہے کہ شدت نزع کا سبب تو تعلقات ہی ہیں جسقدر روح کو ناسوت
سے تعلق ہوگا اسی قدر نزع میں شدت ہوگی مگر تعلقات دو قسم پر ہیں ایک وہ جو مانع عن
الآخرت ہیں جیسے جائداد اور مال وغیرہ کی محبت ان سے جو شدت ہوتی ہے اُس سے تکلیف
سخت ہوتی ہے دوسرے وہ تعلقات ہیں جو آخرت سے مانع نہیں ہیں بلکہ معین آخرت ہیں
اور یہ وہی تعلقات ہیں جو اس کے مصداق میں داخل ہے ؎ اسیرش نخواہد خلاصی زبند
اسکی تعیین عنقریب آتی ہے۔ ان سے بھی نزع میں شدت ہوتی ہے مگر اس سے روحانی تکلیف نہیں ہوتی بلکہ وہ شدت
لذیذ ہوتی ہے کیونکہ اُسکا منشا قید لذیذ ہے تفصیل اسکی یہ ہے کہ اہل اللہ کو حقیقی تعلق تو بجز ذات حق کے
کسی سے نہیں ہوتا اور اس کا مقتضا سہولت نزع ہے مگر بعض حضرات کو حق تعالیٰ کی طرف سے ارشاد خلق و تربیت
طالبین کی خدمت سپرد ہوتی ہے اور یہ بدوں توجہ الی الخلق کے نہیں ہو سکتی اسلئے اُن کو
امر حق سے مخلوق کی طرف توجہ کرنا پڑتی ہے اور اصلاح و ارشاد کیلئے ان سے ایک گونہ
تعلق ہو جاتا ہے اور یہ تعلق چونکہ بامر حق ہے اسلئے آخرت سے مانع نہیں ہوتا بلکہ موجب اجر
اور سبب ترقی ہے جس سے جسقدر اصلاح و ارشاد کا فیض ہوگا اُسیقدر اُسکے درجات میں اضافہ
ہوگا چونکہ یہ خدمت سب سے زیادہ انبیاء علیہم السلام کے سپرد کیگئی ہے اسلئے انبیاء علیہ السلام
کو مخلوق کیساتھ یہ تعلق زیادہ ہوتا ہے اور انبیاء میں بھی ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے

سپرد سب سے زیادہ خدمت تھی کیونکہ قیامت تک آنیوالی مخلوق کیلئے آپ ہی رسول ہیں آپ کے بعد کوئی دوسرا رسول آنیوالا نہیں تو آپ کو سب سے زیادہ ارشاد و اصلاح کی فکر و اہتمام تھا اسلئے آپ کو نزع میں شدت زیادہ ہوئی کیونکہ روح کو امت کیساتھ تعلق تھا اور وصال کے وقت بھی آپ کو انکا اہتمام تھا مگر یہ تعلق لذیذ اور یہ فکر خوشگوار تھا آپ کیلئے اسمیں اجر اور ترقی درجات تھی اسلئے شدت نزع سے جسم کو تو تکلیف ہوئی مگر روح کو کچھ تکلیف نہیں ہوئی انبیاء کے بعد بعض اولیاء ایسے ہوتے ہیں جنکے سپرد خدمت ارشاد و تبلیغ ہوتی ہے اُن کو بھی نزع میں بوجہ طالبین کی فکر کے شدت ہوتی ہے مگر ان کو انبیاء کے برابر شدت نہیں ہوتی کیونکہ ان کی ذمہ داری انبیاء کے برابر نہیں ہے اسلئے اُن کو مخلوق کے ساتھ اصلاح و ارشاد کا تعلق بھی انسے کم ہوتا ہے اور جن بعض اولیاء کے سپرد یہ خدمت نہیں ہوتی وہ بالکل آزاد ہوتے ہیں اُنکو کسی کا فکر ہے نہ کسی سے تعلق ہے ان کا نزع بہت سہل ہوتا ہے ایسے لوگ مرتے ہوئے بڑے شاداں و فرحاں ہوتے ہیں بعضے غزل پڑھتے ہوئے جاتے ہیں بعضے ہنستے ہوئے جان دیتے ہیں عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

خرم آنروز کزیں منزل ویراں بروم | راحت جاں طلبم وز پئے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے | تا در میکدہ شاداں و غزلخواں بروم

ایک بزرگ مرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم | جسم بگذارم سراسر جاں شوم

اُن کی یہ حالت دیکھکر بعض لوگوں کو خیال ہوتا ہے کہ یہ لوگ اُن اولیاء سے افضل ہیں جنکے سپرد خدمت ارشاد ہے کیونکہ وہ موت کے وقت انکی برابر بےفکر نہیں ہوتے اُنکو اپنی ذمہ داری کی بھی فکر ہوتی ہے اپنے متعلقین کا بھی خیال ہوتا ہے اسی وجہ سے اُن کو نزع میں شدت بھی واقع ہوتی ہے مگر یہ اعتقاد فضیلت صحیح نہیں بلکہ اکثر وہی اولیاء افضل ہوتے ہیں جو صاحب ارشاد ہیں کیونکہ اُن کی حالت انبیاء علیہم السلام کے مشابہ ہے اور جو جتنا انبیاء کے مشابہ ہوگا وہ دوسروں سے افضل ہوگا لیکن تمکو اس تجویز کا حق نہیں ہے کہ اپنے لئے صاحب ارشاد ہونیکی تمنا کرو بس بادشاہ کو اختیار ہے کہ تمہارا امتحان لیکر جو عہدہ جسکو چاہے

دیدے جسکو چاہے تحصیلدار بنادے جسکو چاہے ڈپٹی کلکٹر بنادے اور اُسے یہ بھی اختیار ہے کہ کسی کو کوئی عہدہ بھی ندے بلکہ اُسکو اپنا مصاحب بنالے محمود غزنوی کو اختیار تھا کہ ایک کو حسن میمندی بنادے اور ایک کو ایاز بنادے حسن میمندی کے سپرد قلمدان وزارت تھا سلطنت میں تصرف کرنیکا بڑا اختیار اُسے دیا گیا تھا اور ایاز کو اختیار کچھ نہ تھا مگر تقرب اتنا تھا کہ حسن میمندی کو باوجود سب اختیارات کے وہ تقرب حاصل نہ تھا بعض دفعہ یہ نوبت آتی تھی کہ محمود سے بات کرنیکی ایاز کے سوا کسی کو ہمت نہوتی تھی اُسوقت حسن میمندی بھی ایاز کی خوشامد کرتا تھا کہ بادشاہ تک یہ بات پہونچادو حالانکہ یہ وہ شخص ہے جسے سلطنت میں کوئی بھی عہدہ حاصل نہیں اور امور سلطنت میں ایک پیسہ کا تصرف بھی اُسکے اختیار میں نہیں مگر تقرب کی یہ حالت ہے پس سالک کو اپنے لئے کسی تجویز کا حق نہیں خدا تعالی کے سپرد کردو اپنے آپ کو وہ جو چاہیں کریں خواہ صاحب سلسلہ بنادیں یا درباری بنالیں ؎

ہر کسے را بہر کارے ساختند   میل او اندر دلش انداختند

سرکاری باغ میں جو درخت بھی ہے عمدہ ہی ہے کوئی درخت آم کا ہے جس سے مخلوق کو نفع ہوتا ہے اور کوئی درخت گلاب کا ہے جسکے پھولوں کو خاص بادشاہ کی میز پر لاکر رکھا جاتا ہے کسی کو اُسکے توڑنیکی اجازت نہیں پھر تم کون ہو جو آم ہی کا درخت بننا چاہو گلاب نہ بننا چاہو اُسی باغ میں بلبل بھی ہے جسکا کام بجز نالہ و آہ زاری کے کچھ نہیں مگر سب کے سب اُسی باغ کے رہنے والے ہیں ان میں کوئی ناقص نہیں سب کامل ہی ہیں گو حالات مختلف ہیں ؎

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خنداں است   بعندلیب چہ فرسودہ کہ نالاں است

مولانا فرماتے ہیں ؎

گر بعلم آئیم ما ایوان اوست   ور بجہل آئیم ما زندان اوست

گر بخواب آئیم مستان ویئم   ور بہ بیداری بدستان ویئم

اُنکو اختیار ہے جس حال میں چاہیں رکھیں جب وہ اپنا بنالیں گے تو ہر حال میں تم انہی کے کہلاؤ گے اور جسکو وہ اپنا بنالیتے ہیں وہ ناقص نہیں رہتا وہ کامل ہی ہوتا ہے گو حالات اور مذاق میں تفاوت ہو چنانچہ انبیاء علیہم السلام کے مذاق و حالات و کیفیات میں بھی باہم

تفاوت ہے مگر ان میں کوئی ناقص نہیں سب کامل ہیں گو بعضے اکمل ہوں مگر بعض کی اکملیت
کسی کے نقص کو مستلزم نہیں کامل سب ہیں اور یہاں سے میں ایک بات پر تنبیہ کرنا چاہتا
ہوں وہ یہ کہ آج کل ایک سیرت نبویہ شائع ہوئی ہے جسکو تعلیمیافتہ طبقہ میں بہت مقبولیت
حاصل ہے لوگ شوق سے اسکو خریدتے ہیں کیونکہ کاغذ چکنا اور لکھائی عمدہ ہے ظاہری ٹیپ
ٹاپ بہت ہے لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کا باطن بھی ایسا ہی ہوگا مگر حقیقت یہ ہے کہ اسکو دیکھکر
کوئی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ یہ کسی نبی کی سیرت ہے کیونکہ کمالات نبوت سے اسمیں بحث ہی نہیں بس
یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی مدبر بادشاہ کی سوانح عمری ہے زیادہ تر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تدبیر
و انتظام ہی کا پہلو دکھلایا گیا ہے اور اگر کسی جگہ اتفاق سے آپ کے کمالات نبوت کا ذکر بھی
ہے تو غضب یہ کیا ہے کہ دوسرے انبیاء میں نقص نکالا گیا ہے چنانچہ شروع ہی میں حضور
صلی اللہ علیہ وسلم کی جامعیت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ حضور تمام کمالات کے جامع تھے
اور دیگر انبیاء علیہم السلام تمام کمالات کے جامع نہ تھے کسی میں کوئی صفت تھی کوئی نہ تھی چنانچہ
حضرت نوح علیہ السلام کی بابت دعوی کیا ہے کہ وہ رحم سے خالی تھے اور دلیل میں یہ واقعہ پیش
کیا ہے کہ انھوں نے اپنی قوم کیلئے سخت بددعا کی تھی رب لا تذر علی الارض من الکفرین
دیارا (اے پروردگار زمین پر کفار میں سے کسی بسنے والے کو نہ چھوڑیئے سبکو تباہ کر دیجئے ۱۲ جامع)
یہ کتنی بڑی گستاخی ہے کہ نبی کو رحم سے خالی کہا جائے انا للہ وانا الیہ راجعون ٥ رہی دلیل
تو اس کا جواب خود نص میں موجود ہے۔ نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو برس تک اپنی قوم
کو سمجھایا غور کیجئے کہ سمجھانیکی بھی کوئی حد اتنی مدت تک ان کی اذیتوں پر صبر کرنا تھوڑی
بات ہے ذرا کوئی کرکے تو دکھلائے نو سو برس تو کیا نو ہی برس میں حقیقت معلوم ہو جائیگی
تو نوح علیہ السلام کا یہ تھوڑا رحم ہے کہ اتنی مدت تک قوم کی بدحالی اور ایذا رسانی پر صبر کرتے
رہے اور بددعا نفرمائی اس مدت کے بعد اگر وہ از خود بھی بددعا فرماتے تو اسکو بیرحمی نہیں
کہسکتے تھے چہ جائیکہ انھوں نے خود بددعا نہیں فرمائی بلکہ جب انکو وحی سے معلوم ہو گیا کہ
اب ان میں سے کوئی ایمان نہ لائیگا اور ان کی تقدیر میں کفر ہی پر خاتمہ لکھا ہے اسوقت
دعا فرمائی۔ بتلایئے جب ایک قوم کی اصلاح سے مایوسی ہو جائے تو اسوقت انکا باقی

رہنا بہتر ہے یا ہلاک ہو جانا ظاہر ہے کہ ایسی قوم کی بقا میں کچھ فائدہ نہیں بلکہ اندیشہ فساد کا ہے
کہ یہ دوسروں کو بھی غارت کرینگے اسوقت انپر بددعا کرنا بیرحمی نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے حق میں
رحم ہے چنانچہ نوح علیہ السلام نے اپنی بددعا میں اس بات کو ظاہر فرما دیا تھا انك ان
تذرهم يضلوا عبادك ولا يلدوا الا فاجرا كفارا (خداوندا اگر آپ ان کو زندہ
چھوڑیں گے تو یہ آپکے دوسرے بندوں کو بھی گمراہ کردینگے اور کافر فاجر کے سوا کسی کو نہ جنینگے
اور یہ بات نوح علیہ السلام نے اپنے قیاس سے نہیں فرمائی بلکہ وحی سے ان کو معلوم ہو چکا
تھا کہ اب ان میں یا ان کی اولاد میں کوئی بھی ایماندار نہ ہوگا واوحی الی نوح انه لن
يؤمن من قومك الا من قد آمن فلا تبتئس بما كانوا يفعلون ٥ تو بتلایئے
اس حالت میں اگر نوح علیہ السلام اُن کیلیے بددعا نہ فرماتے تو اسکا انجام کیا ہوتا ظاہر ہے
کہ اسوقت تمام دُنیا کافروں سے بھری ہوئی تھی مسلمان بہت ہی کم معدودے چند تھے
اور کفار کے متعلق معلوم ہو چکا تھا کہ نہ یہ خود ایمان لائیں گے نہ انکی اولاد میں کوئی مومن
ہوگا اور مسلمانوں کی اولاد کے متعلق یہ یقین نہ تھا کہ سب ایماندار ہی ہوں گے بلکہ انمیں
بھی ایماندار اور کافر دونوں قسم کے لوگ ہونیوالے تھے بلکہ مسلمانوں کی اولاد میں بھی غلبہ
کفار ہی کو ہونیوالا تھا اب اگر اُس زمانہ کے کافر غرق نکیئے جاتے اور اُن کی اولاد بھی اسوقت
موجود ہوتی تو مسلمانوں کو دنیا میں زندہ رہنا دشوار ہو جاتا (احادیث سے معلوم ہوتا ہے
کہ اسوقت جتنے لوگ موجود ہیں وہ نوح علیہ السلام کے صرف تین بیٹوں کی اولاد ہیں جب
تین آدمیوں کی اولاد میں کفار کا اسقدر غلبہ ہے جو مشاہدہ میں آرہا ہے تو دنیا بھر کے
آدمیوں کی اولاد میں کفار کا کیا کچھ غلبہ نہ ہوتا خصوصاً جب کہ اُن کفار کی اولاد میں مسلمان
کوئی نہ ہوتا سب کافر ہی ہوتے اس مقدمہ کے ملانیکے بعد تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعی نوح
علیہ السلام نے مسلمانوں کے حال پر بہت ہی رحم فرمایا جو اپنے زمانہ کے کافروں پر بددعا
کی ورنہ آج کفار کا وہ غلبہ ہوتا کہ مسلمانوں کو حقیقت نظر آجاتی اور اُن کو جینا محال ہو جاتا ۱۲)
غرض اس سیرت کے مصنف نے صرف ایک پہلو کو دیکھا کہ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم
کے واسطے ایسی سخت بددعا کی جو بیرحمی معلوم ہوتی ہے مگر اُس نے دوسرے پہلو کو نہ دیکھا

کہ اُن کی یہ بد دعا مسلمانوں کے حق میں خود جنمیں یہ مصنفؔ بھی داخل ہے سراسر رحم تھی ورنہ سیاں کو آج دنیا میں رہنا اور کفار سے جان بچانا دوبھر ہو جاتا یہ اعتراض تو نوح علیہ السلام پر تھا اسکے بعد لکھا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام میں تمدن و سیاست کا مادہ نتھا۔ معلوم اسکے پاس کونسی وحی آگئی تھی (یا اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا چہرہ دیکھکر قیافہ سے پہچان لیا تھا کہ ان میں یہ مادہ ہے اور وہ مادہ نہیں ۱۲) کچھ نہیں اس اعتراض کا منشا صرف یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی زندگی میں سلطنت کا انتظام اپنے ہاتھ میں نہیں لیا تھا اس سے ان حضرت نے یہ استنباط کر لیا کہ انمیں یہ مادہ ہی نتھا حالانکہ عدم ظہور شئے ظہور رعدم کو مستلزم نہیں بھلا اگر کسی شخص کو زندگی بھر روپیہ تقسیم کرنیکا موقعہ نملے تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسمیں سخاوت کا مادہ نہیں ذرا اُسکے ہاتھ میں روپیہ دیکر دیکھو اگر پھر بھی وہ سخاوت نکرے اُسوقت تمکو اس بات کا حق ہے ورنہ دعویٰ بلا دلیل ہے اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اگر سلطنت کا موقعہ ہی نملا تو اس سے اُن کا تمدن و سیاست سے خالی ہونا کیسے لازم آگیا اور تمنے کیونکر سمجھ لیا کہ اُن میں انتظامی قابلیت نہیں یہ بات تو جب چل سکتی تھی کہ اُن کو سلطنت کا موقعہ ملتا اور پھر انتظام نکر سکتے پس اس شخص کا اعتراض تو لغو ہو گیا اب میں ثابت کرتا ہوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں تمدن و سیاست اور انتظامی قابلیت بدرجۂ کمال موجود ہے گو اس جوہر سے ابھی تک کام نہیں لیا گیا اور اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کیف انتم اذا نزل فیکم عیسیٰ بن مریم عدلا مقسطا (او کما قال) تمہارا کیا حال ہوگا اُسوقت جبکہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام تمھارے اندر (آسمان سے) نازل ہو کر آویں گے عادل و منصف ہو کر حکومت کریں گے تو حضور نے اُسوقت سے مسرت ظاہر فرمائی ہے جبکہ عیسیٰ علیہ السلام مسلمانوں میں حکومت کریں گے اور آپ اُن کے متعلق عدل و اقساط کی خبر دے رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ عدل و انصاف بدون قابلیت انتظام کے نہیں ہو سکتا عدل وہی کر سکتا ہے جسمیں سیاست کا مادہ بدرجۂ کمال موجود ہو نیز احادیث میں یہ بھی مذکور ہے کہ اُسوقت بہت امن و امان اور خیر و برکت ہوگی جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نہایت عمدگی اور خوبی کے ساتھ سلطنت کا انتظام کریں گے اگر اُن میں فی نفسہ یہ مادہ موجود

نہیں تو اُس وقت کیونکر سلطنت کا انتظام کریں گے پس معلوم ہوا کہ اس شخص نے حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت عیسی علیہ السلام کی جامعیت پر جو اعتراض کیا ہے وہ نہایت لغو ہے حضور کے کمالات ثابت کرنیکا یہ کونسا طریقہ ہے کہ آپ کے بھائیوں میں نقص نکالا جائے کیا حضور اس سے خوش ہو سکتے ہیں ہرگز نہیں ۔ یاد رکھو انبیاء علیہم السلام سب کامل ہیں انہیں ناقص کوئی نہیں یہ اور بات ہے کہ ہمارے حضور اکمل ہیں تفاضل بین الانبیاء سے اسی واسطے منع کیا گیا ہے کہ حضور کو اپنے بھائیوں کی تنقیص گوارا نہیں ۔ الغرض انبیاء علیہم السلام کے مذاق باہم مختلف ہیں مگر کامل سب ہیں اور ہر ایک کا مذاق خدا تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہے اسی طرح صوفیہ نے تفاضل بین الاولیاء سے بھی منع کیا ہے کیونکہ اولیاء اللہ بھی سب مقبول ہیں اور جس کا جو مذاق ہے وہ خدا تعالیٰ کو پسند ہے اُن میں بھی باہم تفضیل کا کسی کو حق نہیں کمالات سے خالی کوئی ولی نہیں یہ اور بات ہے کہ کسی کمال سے حق تعالے نے کام لیلیا اور کسی کمال کو مخفی رکھا اس سے کام نہیں لیا کسی کو صاحب ارشاد بنا دیا اُس سے ہدایت خلق کا کام لیا کسی کو صاحب ارشاد نہیں بنایا اُسے گمنام رکھا مگر قابلیت ارشاد سے وہ بھی خالی نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرات شیخین کیلئے تو سلطنت تجویز کرتے ہیں اور اپنی زندگی میں بعض لوگوں سے یہ فرماتے ہیں کہ اگر میں نملوں تو اس معاملہ کو ابوبکر کے پاس لانا وہ فیصلہ کردیں گے (وغیرہ وغیرہ) اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے بارہ میں فرماتے ہیں کہ یا اباذر انی اریك ضعیفا وانی احبك واحب لنفسك ما احب لنفسی لا تقضین بین اثنین ولا تلین مال یتیم = (او کما قال) انکو دو آدمیوں کے درمیان بھی فیصلہ کرنے سے منع فرماتے ہیں اور مال یتیم کی حفاظت سے روکتے ہیں اور حضرات شیخین کے تمام دنیا کے قضایا کا فیصلہ سپرد فرماتے ہیں تو کیا حضرت ابوذر ناقص تھے کیا ان میں قوت فیصلہ نہ تھی یا وہ مال یتیم کی حفاظت نہ کرسکتے تھے کوئی عاقل یہ نہیں کہسکتا کیونکہ جس شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آنکھوں سے دیکھ لیا ہو اور آپ کی صحبت میں رہا ہو وہ ناقص نہیں رہ سکتا خصوص جس شخص سے آپ کو محبت ہو وہ ناقص رہے ایسا نہیں ہوسکتا مگر پھر بھی آپ حضرات شیخین سے جو کام لیتے ہیں حضرت ابوذر سے وہ کام

نہیں لیتے شاید کوئی یہ کہے کہ حضورؐ نے تو صاف فرمادیا ہے انی اریک ضعیفاً کہ میں تمکو ضعیف پاتا ہوں اسلیے آپنے اُنکو قضاء اور تولیت مال یتیم سے منع فرمایا جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوذر میں نقص تھا اور اُن میں قضاء یا تولیت مال یتیم کا مادہ ہی نہ تھا میں کہتا ہوں کہ ضعف سے نقص لازم نہیں آتا دیکھو بچہ ضعیف تو ہوتا ہے کہ بالغ کی برابر اُسکے اعضاء میں قوت نہیں ہوتی لیکن اگر وہ تام الاعضاء ہے تو اُسے ناقص نہیں کہا جاسکتا ناقص وہ ہے جسکے آنکھ نہو یا ہاتھ کٹا ہوا ہو یا پیر سے لنگڑا ہو لیکن جو بچہ تندرست ہو اور اُسکے سب اعضاء سالم ہوں اُسے ناقص نہیں کہسکتے بلکہ اپنی ذات کے لحاظ سے وہ کامل ہی کہلائیگا گو ضعیف ضرور ہے۔ تو حضورؐ کے ضعیف فرمانے سے حضرت ابوذر کا ناقص ہونا لازم نہیں آتا اگر وہ ناقص ہوتے تو آپ اُن کو فقید فرماتے (یعنی فقید القوی) یا فقیر فرماتے مگر آپ تو ضعیف فرمارہے ہیں پھر اس سے یہ کہاں معلوم ہوا کہ حضرت ابوذر میں استعداد قضاء و قابلیت تولیت یتیم نہ تھی۔ دیکھیے محققین کا مذہب ہے کہ ایمان زیادت و نقص کو قبول نہیں کرتا اور شدت و ضعف کو قبول کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ضعف کا مقابل شدت ہے نہ کہ زیادت نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ ضعف اور نقص ایک نہیں بلکہ دونوں میں فرق ہے پس حضرات صحابہ میں زائد و ناقص کوئی نہیں بلکہ سب کامل ہیں اور جو کمالات حضرات شیخین میں تھے وہ ہر صحابی کے اندر مجتمع تھے البتہ شدید و ضعیف کا فرق ضرور ہے اگر حضرت ابوذر میں ان امور کی قابلیت ہی نہوتی تو حضورؐ کو ان سے منع فرمانے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ حضرت ابوذر نہ رسم پرست تھے نہ جاہل تھے اگر اُن میں ان کاموں کی قابلیت نہوتی تو وہ خود ہی یہ کام نکرتے کیونکہ عدم قابلیت کے ساتھ کسی کام میں ہاتھ ڈالنا یا تو جہالت سے ہوتا ہے کہ اپنی ناقابلیت کی خبر ہی نہو یا رسم پرستی سے ہوتا ہے کہ اپنی ناقابلیت کا علم ہے مگر انکار کرنے میں ہیٹی سمجھتا ہے حضرت ابوذر ان دونوں باتوں سے منزہ تھے اگر کسی کام کی قابلیت اُن میں نہوتی تو وہ ہرگز اُس کام کو ہاتھ نہ لگاتے پس حضورؐ کا انکو منع فرمانا اسکی دلیل ہے کہ اُن میں قابلیت ضرور تھی مگر آپنے اس قابلیت سے کام لینا نہیں چاہا بلکہ انی اریک ضعیفاً فرماکر اس قوت کو ممنوع الاستعمال کردیا اور ہمارا اعتقاد تو یہ ہے

کہ اگر بالفرض حضرت ابوذر میں قابلیت بھی نہ ہوتی اور حضور ان سے قضاء و تولیت کا کام لینا چاہتے تو حضور کے امر کے بعد ان میں بعدًا قابلیت پیدا ہو جاتی کیونکہ آپ کی شان یہ ہے ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

اور حق تعالیٰ کی شان یہ ہے ؎

داد او را قابلیت شرط نیست بلکہ شرط قابلیت داد اوست

مگر آپ نے ان سے یہ کام لینا چاہا ہی نہیں (۱۲) اسی کو میں کہنا چاہ رہا ہوں کہ سالکین کو اپنے لئے کچھ تجویز نہ کرنا چاہیئے حق تعالیٰ جو چاہیں گے تمھارے لئے خود تجویز فرما دیں گے بعض سالکین اپنے لئے مشیخت تجویز کرتے ہیں اور ذکر و شغل سے ان کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ ہم کسی وقت شیخ و مقتدا بنکر مخلوق کی اصلاح کرینگے یاد رکھو جسکے لئے ابھی تک شیخ نے مشیخت تجویز نہیں کی اسکے لئے اس کا خیال کرنا بھی گناہ ہے جیسا کہ حضرت ابوذر کیلئے قضاء بین الاثنین اور تولیت مال یتیم گناہ تھا کیونکہ حضور نے ان کے لئے تجویز نہیں فرمایا تھا اسی لئے سالک کو شیخ کے ہاتھ میں مردہ بدست زندہ ہونا چاہیئے اگر وہ مستحبات سے بھی منع کرے تو انقیاد و اطاعت ہی کرنا چاہیئے بعض لوگ اعتراض کیا کرتے ہیں مشایخ پر کہ یہ مستحبات سے روکتے ہیں مگر وہ کریں تاویل حضرت ابوذر کے قصہ میں کہ حضور نے ان کو قضاء و تولیت مال یتیم سے منع فرمایا حالانکہ قضاء فرض کفایہ ہے اور تولیت مال یتیم بھی جبکہ اس کا حق ادا کر سکتا ہو اور یقیناً حضرت ابوذر اگر کسی یتیم کے مال کی حفاظت کرتے تو ایسی احتیاط سے کرتے جسکی حد نہیں مگر حضور نے انکو منع فرما دیا پھر مشایخ پر کیوں اعتراض کیا جاتا ہے اگر وہ کسی کو روکدیں کہ تم اصلاح خلق اور نفع رسانی مخلوق کا وسوسہ نہ لاؤ اور سنئے جنگ احد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جماعت کو تو حکم دیا جہاد کا کہ صف بندی کر کے کفار کا مقابلہ کریں تلوار چلائیں اور ایک جماعت کو حکم دیا کہ مورچہ پر خاموش بیٹھے رہیں وہاں سے ہرگز نہ ہٹیں اور لڑائی میں شریک نہوں ہاتھ تک نہ ہلائیں گویا ظاہر میں انکو جہاد سے روکدیا مگر حقیقت میں ان کا یہی جہاد تھا اس جماعت کیلئے میدان میں آکر تلوار چلانا گناہ تھا چنانچہ جنگ احد میں جو فتح کے بعد

شکست ہوئی حق تعالیٰ نے اُس کا ایک سبب یہ بھی بتلایا ہے کہ اس مورچہ والی جماعت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی مخالفت کی اسلئے ہمنے فتح کے بعد تمکو شکست دیدی عصیتم من بعد ما اریکم ما تحبون ۰ ان لوگوں نے یہ سمجھا کہ ہم جہاد میں شریک نہیں ہوئے ہمیں بھی کچھ کرنا چاہئے اسلئے بعضے مورچہ سے ہٹ کر میدان میں آگئے اور مال غنیمت پر قبضہ کرنے لگے مگر یہ اُن کے لئے گناہ شمار ہوا گو دوسروں کے حق میں بڑا کام تھا مورچہ والوں کیلئے یہی جہاد تھا کہ حضور نے جہاں بٹھلا دیا تھا وہیں چپ چاپ بیٹھے رہتے وہ اس خاموشی ہی میں جہاد والوں کی برابر تھے یہاں سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہو گیا کہ ترقی کا مدار اعمال ظاہرہ کی زیادتی پر نہیں بلکہ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اعمال ظاہرہ کم کرتے ہیں مگر اُن کی ترقی ہوتی جاتی ہے۔ کیونکہ اُن کے اعمال باطنہ زیادہ ہوتے ہیں جیسے یہ مورچہ والے بظاہر کچھ نہیں کر رہے تھے مگر ثواب میں جہاد کرنیوالوں کے برابر تھے اسی طرح صوفیہ میں ایک جماعت قلندر کہلاتی ہے وہ ظاہر میں فرائض وواجبات کے سوا کچھ زیادہ کام نہیں کرتے مگر برابر اُنکی ترقی ہوتی رہتی ہے کیونکہ اعمال باطنہ اُن کے زیادہ ہوتے ہیں وہ ہر وقت تفکر اور تدبر میں رہتے ہیں قلب کو خدا تعالیٰ سے مشغول رکھتے ہیں اسلئے برابر ترقی میں رہتے ہیں اسی طرح بعض لوگ صاحب ارشاد نہیں ہوتے اُن کا یہ مذاق ہوتا ہے ؎

احمد تو عاشقی بہ مشیخت ترا چہ کار ‌ ‌ ‌ ‌ دیوانہ باش سلسلہ شد شد نشد نشد

ظاہر میں لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان سے فیض تو ہوا ہی نہیں یہ کیسے بزرگ ہیں مگر باطن میں وہ حق تعالیٰ کے ایسے مقرب ہوتے ہیں کہ بعض دفعہ صاحب ارشاد بھی ایسے مقرب نہیں ہوتے اسلئے سالک کا مذاق عاشقانہ ہونا چاہئے۔ اپنے لئے کچھ تجویز نکرے کیسی مشیخت کیسا سلسلہ مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ایک مرید کسی شیخ کی خدمت میں برسوں ذکر وشغل کرتا رہا مگر نفع نہوتا تھا راستہ کھلتا ہی نتھا شیخ سے شکایت کرتا وہ ذکر شغل میں کچھ ترمیم یا اضافہ کر دیتے جب کسی طرح اُسکو نفع نہوا اور شیخ بھی تدبیر کرتے کرتے تھک گئے تو ایک دن انھوں نے مرید سے پوچھا کہ میاں یہ تو بتلاؤ ذکر وشغل سے تمھاری نیت کیا ہے کہنے لگا میری یہ نیت ہے کہ میں اپنی اصلاح کے بعد دوسروں کو نفع پہونچاؤنگا۔ شیخ نے فرمایا کہ یہی

چونر گھسا ہوا ہے جس نے سارے ذکر کو برباد کر رکھا ہے اس خیال سے توبہ کرو تو شرک میں مبتلا ہے ؎

اے بیخبر بکوش کہ صاحب خبر شوی — تا راہ بیں نہ باشی کے راہبر شوی

در مکتب حقائق پیش ادیب عشق — ہاں اے پسر بکوش کہ روزے پدر شوی

زمانۂ پیری ہی میں باپ بننے لگے صاحب پہلے بیٹا تو بن لو بعد ہی میں باپ بننے کا خیال کرنا یہ کیا کہ بیٹا بننے سے پہلے ہی باپ بننے لگے اسلئے میں بار بار کہتا ہوں کہ سالکین کیلئے خیالِ مشیخت گناہ اور سدّراہ ہے تم ہرگز اپنے لئے کچھ تجویز نکرو بس تفویض کردو حضرت حق کے اور حضرت حق کے سپرد کرنا یہ ہے کہ ان کے نائبین کے ہاتھ میں اپنے کو سپرد کردو کہ وہ جو تصرف تمھارے اندر کریں اس سے راضی رہو جو وہ تجویز کردیں اسکے خلاف کا وسوسہ نہ لاؤ ؎

آنکہ جاں بخشد اگر بکشد رواست — نائب ست و دستِ او دست خداست

گر خضر در بحر کشتی را شکست — صد درستی در شکستِ خضر ہست

صبر کن در کار خضر اے بے نفاق — تا نگوید خضر رو ھذا فراق

اور فرماتے ہیں ؎ چوں گزیدی پیر ہیں تسلیم شو۔

مطبع والوں نے اسکو پیرہن لکھدیا ہے جسکا مطلب شاید کوئی یہ سمجھا ہو کہ جب شیخ سے پیرہن (یعنی خرقۂ خلافت) مل جائے اسوقت اسکی اطاعت کرو اسکے بغیر اطاعت نکرنا واہیات۔ یہ لفظ پیرہن نہیں بلکہ پیر الگ لفظ ہے اور ہیں بمعنی خبردار الگ لفظ ہی فرماتے ہیں

؎ چوں گزیدی پیر ہیں تسلیم شو — ہمچو موسیٰ زیر حکم خضر رو

ہمچو اسمٰعیل پیشش سر بنہ — شاد و خنداں پیش تیغش جاں بدہ

تمکو کیا خبر کہ تمکو کیا عہدہ ملنے والا ہے بس تم اپنے کام میں لگو جو عہدہ دینا ہوگا وہ خود دینگے (اور حق تعالیٰ کا دینا یہ ہے کہ وہ اپنے نائبین کے ہاتھ سے کوئی عہدہ دلوا دینگے خواہ مشیخت ہو یا گمنامی ۱۲) بعض اولیاء ایسے بھی ہیں کہ صاحب ارشاد نہیں ہیں مگر ان کی حالت یہ ہوگی المتحابون فی اللہ علی منابر من المسک یوم القیامۃ یغبطھم الانبیاء

والصدیقون (اوکما قال) حدیث میں ہے کہ متحابین فی اللہ قیامت کے دن منابر مسک پر بیفکر بیٹھے ہوں گے ان کی اس حالت پر انبیاء وصدیقین کو رشک آئے گا کہ یہ بڑے بیفکر ہیں علماء قشر تو تھک گئے اسکی تفسیر میں لگے ادھر ادھر کی باتیں کرنے مگر حقیقت تک نہ پہونچے وہ نہ بتلا سکے کہ یہ کون لوگ ہیں اسی لئے عارف شیرازی ایسے مدارس سے برارت ظاہر کرتے ہیں ؎ از قال وقیل مدرسہ حالے دلم گرفت +

حاے امالہ ہے حالا کا اور حالا مخفف ہے حالا منصوب کا ؎

از قال وقیل مدرسہ حالے دلم گرفت   یک چند نیز خدمت معشوق و می کنم

قال وقیل مدرسے دلگرفتہ ہونیکا سبب یہی ہے کہ وہاں حقائق کا انکشاف نہیں ہوتا بلکہ لفظوں ہی کے بکھیر میں رہتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ مدارس بیکار ہیں ہرگز نہیں ان کی بھی ضرورت ہے اور اُن کے بعد خانقاہ میں آنیکی بھی ضرورت ہے نہ تنہا مدرسہ کافی ہے نہ تنہا خانقاہ کافی ہے۔ مدرسہ بمنزلہ وضو کے ہے اور خانقاہ بمنزلہ نماز کے ہے تو جو صوفی مدرسہ میں نہ جائے وہ ایسا ہے جیسے کوئی نماز بلا وضو پڑھا ئے تو وہ صوفی ہوگا ہاں صافی ہوگا مگر وہ صافی نہیں جسکے متعلق کہتے ہیں ؎

صوفی نشود صافی تا درنکشد جامے   بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

بلکہ وہ صافی جس سے برتن اور پتیلیاں صاف کیا کرتے ہیں اور جو عالم مدرسے سے فارغ ہوکر خانقاہ میں نہ جائے وہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص وضو کرکے اُسی پر قناعت کرلے اور نماز نہ پڑھے تو وہ اس کا مصداق ہے ؎

ایہا القوم الذی فی المدرسہ   کل ما حصلتموہ وسوسہ

کیونکہ لفظی اور کتابی علم سے حقایق کا انکشاف نہیں ہوتا پس خانقاہ بلا مدرسے کے خانقاہ نہیں مخواہ مخواہ ہے اور مدرسہ بلا خانقاہ کے درس سے مشتق نہیں بلکہ درس سے مشتق ہے جسکے معنی مٹنے کے تو وہ مٹانیکے قابل ہے غرض علماء قشر تھک گئے اور اُن کو پتہ نہ چلا کہ متحابین فی اللہ کا مصداق اس حدیث میں کون لوگ ہیں محققین عرفا نے پتہ لگا لیا یہ بڑے غماز ہیں انھوں نے کہا یہ وہ اولیاء ہیں جو صاحب ارشاد نہیں ان کے ذمہ کسی کی اصلاح